خمینی کے دیس میں

افضال شاہد

1
915.5
شاہ

نایاب پبلشرز

دلیں میں" کو جس انداز میں پذیرائی ملی اور اسے ادبی، صحافتی اور علمی ملقوں
ح سراہا گیا یہ سب میرے لئے بڑا اعزاز ہے۔ مجھے اس صورتحال نے بڑا حوصلہ
یوں تو یہ میرا پہلا باقاعدہ سفرنامہ تھا مگر اس تجربے نے میری سوچ کو وسعت
از تحریر کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ بعض نقادوں نے اس سفرنامے کو علمی، کچھ
سی چند نے صحافتی اور مولانا اجمل نیازی نے عقیدت کے رنگ میں ڈوبا
۔ یہ سارے اعزازات سر آنکھوں پر۔ میرا ایمان ہے کہ لکھنے والا جذبوں سے
نہ ہو قلم کی حرمت کا خیال رکھے اور لفظوں کی دلالی نہ کرے تو تحریر میں
ہر بات قاری کے دل کو لگتی ہے۔ میں اپنے قارئین، دوستوں اور دشمنوں کا
ار ہوں جن کی وجہ سے "خمینی کے دیس میں" کا دوسرا ایڈیشن آپ
میں کامیاب ہوا۔

افضال شاہد

قیمت سو روپے

Imam Khomeini Library
Karachi.

Imam Khomeini Library
Karachi.

خمینی کے دیس میں

سفرنامہ ایران

افضال شاہد

نایاب پبلشرز
۴۴۴ ای - موچی گیٹ - لاہور

جملہ حقوق دائمی بحق قراۃ العین شاہد و حسن شاہد محفوظ ہیں

Imam Khomeini Library
Karachi.

Imam Khomeini Library
Karachi.
881
5-03-96
915.5
ش ا ھ

مصنف ـــــــ افضال شاہد

ناشر ـــــــ عروج فاطمہ طاہر / منزہ شاہد

ـــــــ نایاب پبلشرز موچی گیٹ لاہور

کتابت ـــــــ خاور بٹ

سرورق ـــــــ نعیم احسن

تاریخ اشاعت ـــــــ بار اوّل جنوری ۱۹۸۹ء بار دوم مارچ ۱۹۹۰ء

مطبع ـــــــ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

تقسیم کار ـــــــ نگارشات ۳، ٹمپل روڈ لاہور

انتساب

بہشتِ زہرا سلام اللہ علیہا تہران اور
گلستانِ شہدا اصفہان کے
مکینوں کے نام

ترتیب :

۱۔ جمبو جیٹ اور بمبئی کے گلاب جامن
۲۔ تہران کی اکبری منڈی
۳۔ دن ہندوانہ تو مسلمانا
۴۔ لوک ورثہ اور ثقافتِ جدید
۵۔ عالمی کانفرنس دفاع و تجاوز تہران ۸ تا ۱۰ اگست ۱۹۸۸ء
۶۔ عراق ایران جنگ اور عالمی رائے عامہ
۷۔ شہرِ طباعت کی سیر
۸۔ زندہ رُود
۹۔ مقدّس سفر

جمبو جیٹ اور بمبئی کے گلاب جامن

ایران، عراق جنگ کو شروع ہوئے آٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور انقلاب اسلامی ایران کو وقوع پذیر ہوئے ایک دھائی سے اُوپر کا عرصہ ہو چلا تھا۔ جس روز امام خمینی نے ایک عوامی راہنما کی حیثیت سے برسوں کی مُلک بدری کے بعد ایران کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اور یہ خبریں آنی شروع ہوئی تھیں کہ ایران کے انقلاب پسند مسلمانوں نے اپنے سیاسی اور رُوحانی قائد کی گاڑی کو بھی کندھوں پر اُٹھا لیا تھا اسی روز سے دل میں یہ آرزو تڑپ رہی تھی کہ وہ سرزمین دیکھی جائے جس پر اس نوع کے جیالے بستے ہیں اُن دنوں میں ایک مقامی جریدے کے مدیر کے فرائض انجام دے رہا تھا، ذہنی رُجحان زیادہ تر ادبی اور ثقافتی تھا، سیاست کا طالب علم اور ایک ادنیٰ سیاسی کارکن ہونے کے باوجود سیاسی رویّے ابھی منزل کا تعیّن کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ پاکستان میں خاص طور پر اور جنوبی ایشیا اور اسلامی دُنیا میں عمومی طور پر روز بروز بدلتے ہوئے حالات نے عجیب و غریب قسم کے تضاد کا شکار بنا دیا تھا۔ بڑی طاقتوں کا رویّہ، جنوبی ایشیا کے عوام کی محرومیاں اور سیاسی اور اقتصادی بے کسی، پاکستان میں ایک بار پھر فوجی آمریت کی آمد اور دیگر حالات نے ایک طرف تو بڑی طاقتوں اور خاص طور پر امریکہ اور اس کے حواریوں کے خلاف شدید قسم کی نفرت پیدا کر دی تھی اور دوسری طرف اس بات کا فیصلہ کرنا بے حد مشکل نظر آ رہا تھا کہ پاکستان میں کس طرح

کے انقلاب کی بات کی جائے۔ ایک کارکن صحافی ہونے کی حیثیت سے اس ذمہ داری کا احساس بھی تھا کہ ایک OPINION MAKER کا کردار ادا کرنا ہے۔ اس صورتِ حال میں اپنے ذاتی مطالعے اور عالمی حالات کے پیشِ نظر یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ اس ملک میں انقلاب ناگزیر ہے۔ ایک ایسا انقلاب جو عوام کی تقدیر بدل دے۔ پاکستان میں موجود اسلامی نظام کی بات کرنے والی سیاسی جماعتوں کے ماضی کے کردار کو دیکھتے ہوئے اور اُن کے حال کی سرگرمیوں پر نظر ڈالتے ہوئے اسلامی انقلاب والی بات حلق سے نہیں اُترتی تھی چنانچہ جب ایران میں اسلامی انقلاب کا معاملہ اُٹھا اور یہ بات یقینی ہوگئی کہ وہاں کے علماء اس انقلاب کا ہراول دستہ ہیں تو مجھے اس انقلاب میں کوئی پسندیدہ بات نظر نہ آئی اور میں نے بھی بہت سے دوسروں کی طرح یہ نظریہ قائم کیا کہ قُم کے ایک مکتبۂ فکر کے چند علمائے نے ایرانی قوم کو دین کے نام پر بے وقوف بنایا ہے اور یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے۔ کچھ ہی دن جاتے ہیں اور وہاں ایک حقیقی عوامی انقلاب آئے گا اور ایرانی قوم اپنا قبلہ "درست" کرلے گی۔ ایرانی انقلاب کے آغاز کے دنوں میں ایران کے بارے میں بڑی متضاد اور پُراسرار باتیں سُنائی دیتی رہیں۔ کوئی کہتا تمام ایرانی عورتوں کو گھروں میں بٹھا دیا گیا ہے، ایران کی ساری فوج اور خاص طور پر جرنیلوں کو موت کی نیند سُلا دیا گیا ہے، لوگ ڈر کے مارے گھروں میں بیٹھ گئے ہیں، زندگی تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور کچھ ہی دن جاتے ہیں کہ کوئی بھی بڑی طاقت خاص طور پر فرانس ایران پر قبضہ کرلے گا اور یوں دنیا کے نقشے سے ایک بڑے اسلامی ملک کا نام مِٹ جائے گا۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ امریکہ کے سفارت خانے والا مشہور واقعہ ہُوا اور کُھلے عام "مرگ بر امریکا" کے نعرے لگنے لگے اور یُوں آہستہ آہستہ مغرب کے پراپیگنڈے کی قلعی کُھلنے لگی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ چند فیصد پڑھے لکھے لوگ تو اس پراپیگنڈے کی حیثیت کو سمجھ رہے تھے مگر اُن کو کون سمجھائے جنہیں سُنی سنائی زیادہ مزہ دیتی ہیں۔ چنانچہ یہ بات عام ہوگئی کہ ایران میں بڑے ظلم ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کو پیدا کرنے میں بلاشبہ مغرب کے ذرائع ابلاغ اور خاص طور پر امریکہ اور اس کے بعض مسلمان حواری بھی پیش پیش تھے جن کا

مطمعِ نظر صرف یہ تھا کہ اس طریقے سے اس عوامی اور اسلامی انقلاب کو سبوتاژ کیا جائے تاکہ دنیا میں بچ رہنے والی چند ملوکی ریاستیں اس انقلاب کی زدّ میں نہ آئیں (بعد کے حالات نے اس مفروضے کو سو فیصد سچ ثابت کیا ہے کہ ان ملوکی ریاستوں کے فرمانرواؤں نے ایران عراق جنگ میں نہ صرف کھلم کھلا سوشلسٹ عراق کا ساتھ دیا بلکہ ایران کو سفارتی، سیاسی، اقتصادی اور دیگر شعبوں میں بھی نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کیا) عراق ایران جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی ایران میں نت نئے واقعات نے جنم لینا شروع کیا اور جنگ بندی کے اعلان تک یہ الف لیلوی داستانوں کا مرکز بنا رہا ۔ تنقید کے نشتر تھے کہ برس رہے تھے۔ اور یہ بھی حقیقت کہ عراق، ایران جنگ کے دوران ایران کی جو تصویر دکھائی جا رہی تھی وہ خاصی سوچ طلب اور گھمبیر تھی ۔ اس تصویر کا ایک رُخ یہ بھی تھا کہ آدھی ایرانی قوم اور خاص طور پر نوجوان زبردستی جنگ کے شعلوں میں جھونک دیئے گئے ہیں اور اس ضمن میں اُن کے مذہبی جذبات کا سہارا لیا گیا ہے ۔ یہ ۱۹۸۳ء کی بات ہے میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر رہا تھا۔ حج شروع ہونے میں چند دن باقی تھے۔ ایرانی حاجیوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آ رہی تھیں، اخبارات میں بھی گاہے گاہے اِس بات کا تذکرہ ملتا تھا کہ شاید سعودی حکومت ایرانی حاجیوں کو مکّہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔ وجہ اس کی یہ بتائی جا رہی تھی کہ ایرانی حاجی وہاں سیاسی مظاہرے کرتے ہیں جس سے انتظامات درہم برہم ہوتے ہیں۔ حج کا آغاز ہوا تو مکّہ کی گلیوں میں مجھے امام خمینی کی بڑی بڑی تصاویر دکھائی دیں پھر میں نے دیکھا کہ ایرانی حاجی اپنا پرچم اٹھائے۔ ایک ترتیب کے ساتھ حرم کے باہر کھڑے ہیں اور یہ نعرے لگا رہے ہیں ۔

مرگ بَر امریکا

مرگ بَر رُوسیا

مرگ بَر اسرائیل

مرگ بَر سامراج

اللہ ھواچبر ۔ خمینی راہبر (اللہ اکبر) ایرانی "ک" کو "چ" بولتے ہیں۔
میرے ذہن میں اس منظر کو دیکھ کر سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ یہ کس قسم کا سیاسی مظاہرہ ہے اور اس تنظیم کے ساتھ کھڑے یہ سینکڑوں ایرانی انتظامات میں کس طرح کا خلل ڈال رہے ہیں۔ نعروں پر غور کیا تو اُن میں بھی کوئی بُرائی نظر نہ آئی۔ سامراج پر لعنت بھیجنا کہاں منع ہے۔ شیطان کی نفی نہ کرو تو اللہ کا ذکر شروع نہیں کرتے۔ اوّل ردّ ہے بعد اقرار یہ تو اسلام کی بنیاد ہے۔ پھر چند برس بعد ایران والوں کو سچ کہنے کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ جب حرم کعبہ کے باہر جہاں انسانوں کے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے وہاں ایرانی حاجیوں کے لیے گولیوں کی بوچھاڑ تھی اور پھر عالم اسلام نے یہ بھی دیکھا کہ گزشتہ برس ایرانی حاجیوں کو سعودی عرب میں داخل تک نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ وہ چند وارداتیں تھیں جو میرے اس شوق کے لیے مہمیز کا کام کر رہی تھیں کہ مَیں امام خمینی کے دیس کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں، وہاں کے پالیسی میکروں سے گفتگو کروں، تہران کی پُر رونق سڑکوں پر گھوموں، دیہاتوں میں جاؤں، لوگوں سے بالمشافہ ملاقاتیں کروں اور ان تمام خبروں سے ایران کے حالات کا موازنہ کروں جو مغرب کی خبر رساں ایجنسیوں اور خبریں گھڑنے والے دیگر اداروں کی وساطت سے ہمیں موصول ہو رہی تھیں۔

اخبارات اُن دنوں ایران کا جو نقشہ پیش کر رہے تھے وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ عراق نے ایران کے سرحدی شہروں کو تو تباہ کیا ہی ہے۔ تہران، اصفہان، کرمان اور دیگر بڑے شہروں کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا ایران افراتفری اور بھاگ دوڑ کے عالم میں ہے اور کسی کو راہ سجھائی نہیں دے رہی ۔ ان خبروں سے جو نقشہ اُبھرتا تھا۔ اس کا موازنہ جب اپنے ہاں ہونے والی سترہ روزہ جنگ کے ساتھ کرتا تو ان خبروں کی صداقت پر یقین کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر دل میں یہ خواہش شدّت اختیار کر لیتی کہ اس قوم کا حال دیکھا جائے جو آٹھ برس سے حالتِ جنگ میں ہے۔ ہم تو سترہ روز میں "پُرباش" ہو گئے تھے۔ آٹھ برس مسلسل جنگ لڑنے والے کس حال میں ہیں اور اتنی طویل جنگ کس انداز سے لڑ رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال مجھے خاصی پُرکشش دکھائی دیتی تھی۔

یہ ۲ اگست کی دوپہر تھی۔ مَیں دفتر میں معمول کے کام میں مشغول تھا کہ خانۂ فرہنگِ ایران لاہور کے ڈپٹی ڈائریکٹر آقا صادق گنجی کا فون آیا۔ (موصوف اچھی اُردو بول لیتے ہیں اور اپنے دیگر ایرانی سفارت کاروں کی طرح بارِیش نوجوان ہیں جن کے چہرے پر ہمہ وقت مسکراہٹ رہتی ہے) گنجی کہہ رہے تھے کہ تہران میں کوئی کانفرنس ہو رہی ہے اور ۵ اگست کی شام میری کراچی سے فلائٹ ہے چنانچہ فوری طور پر پاسپورٹ وغیرہ لے کر قونصلیٹ جنرل پہنچوں مَیں پوچھتا ہی رہ گیا کہ کانفرنس کا موضوع کیا ہے، مجھے وہاں کوئی مقالہ پڑھنا ہے، رپورٹنگ کرنی ہے یا صرف مبصّر کی حیثیت سے شریک ہونا ہے مگر اُن کا کہنا تھا کہ آپ کو تہران جانا ہے بس آپ جلدی سے آجائیں۔ ایک طرف تو اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ امام رضاؑ کی سرزمین پر جانا نصیب ہو رہا ہے جہاں دُنیاوی کارگزاری کے ساتھ ساتھ رُوحانی سکون کا اہتمام بھی ہو گا مگر دوسری جانب میں اس مشکل میں تھا کہ ۵ اگست ہی سے میں لاہور سے فنکاروں اور دانشوروں کا ایک قافلۂ امن لے کر کراچی اور حیدر آباد کے دورے پر جا رہا تھا۔ بشریٰ رحمٰن، مصطفےٰ قریشی، شوکت علی، قتیل شفائی، ثمینہ پیرزادہ اور عثمان پیرزادہ سے روانگی بھی طے ہو چکی تھی۔ اس دورے کا اہتمام سروسز کوآپریٹو کریڈٹ کارپوریشن کے چیئرمین ذوالفقار اعوان نے کیا تھا۔ جب اُن سے اس نئی صُورتِ حال پر بات ہوئی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ایران جانا زیادہ ضروری ہے کیونکہ وہاں ایک انٹرنیشنل فورم کا اہتمام ہے۔ کراچی قافلۂ امن پھر لے جائیں گے (افسوس کہ حالات نے ابھی تک اجازت نہیں دی کہ ہم کراچی اور حیدر آباد والوں سے جا کر پوچھ سکیں کہ آخر بھائی کا خون بھائی کے ہاتھوں کب تک بہتا رہے گا) پاسپورٹ دیکھا تو معیاد ختم ہو چکی تھی۔ یہ نیا مسئلہ تھا بہر حال پاسپورٹ آفس والوں کی مہربانی سے یہ مرحلہ بھی خلافِ توقع بخوبی گزر گیا۔ صادق گنجی سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ ۵ اگست کو ۸ بجے رات کراچی سے تہران کے لیے فلائٹ ہے مگر ابھی لاہور کراچی کنفرم نہیں ہو رہی۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ اس بات سے لاعلم ہیں کہ پاکستان سے اور کون اس کانفرنس میں جا رہا ہے اُنہیں صرف اس بات کا پتہ ہے کہ لاہور سے میرے علاوہ سیّد افضل حیدر بھی مدعو ہیں۔ اگلے روز خانۂ فرہنگِ ایران ہی میں سیّد صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی وہ کچھ کرنسی اور روانگی کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے

اور خانہ فرہنگ کے سابق ڈائریکٹر علی آورسجی کا تہران کا ایڈریس وغیرہ نوٹ کر رہے تھے۔ سید صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ حکومتِ ایران کی دعوت پر اس کانفرنس میں جا رہے ہیں مگر اُن کی دو بیٹیاں اس سفر میں اُن کے ہمراہ ہیں۔ صادق گنجی نے بتایا کہ کراچی ایئر پورٹ پر خانہ فرہنگِ کراچی کے ڈائریکٹر ہمیں لینے کے لیے موجود ہوں گے اور وہ کانفرنس کے بارے میں بریفنگ بھی دیں گے۔ ۵ اگست کو جمعہ کا روز تھا۔ میں صبح کی فلائٹ سے کراچی پہنچا۔ ایئر پورٹ سے باہر نکلا تو کوئی بھی ایرانی سفارت کار موجود نہ تھا ایئرپورٹ کے پبلک بوتھ سے فون کیا۔ اُدھر سے جواب آیا کہ ہمیں کوئی اطلاع نہیں آپ خود خانۂ فرہنگ آجائیں۔ ایئرپورٹ سے ٹیکسی پکڑی خانۂ فرہنگ ایران کراچی پہنچا ڈائریکٹر صاحب خُود بھی حیران تھے کہ یہ بن بلایا مہمان کہاں سے آگیا ہے اُن کی زبانی یہ رُوح فرسا خبر ملی کہ علامہ عارف الحسینی کو آج ہی صبح شہید کر دیا گیا ہے۔ قلب و ذہن پر عجیب طرح کی سراسیمگی چھا گئی۔ ۳ بجے شاہِ خراسان میں علاّمہ صاحب کی شہادت کے سلسلے میں خصوصی مجلس کا اہتمام تھا۔ خانۂ فرہنگ کے ڈائریکٹر اور چھٹی کے باوجود وہاں موجود دیگر عملہ وہیں جا رہے تھے۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ مجھے واپس ایئرپورٹ چھوڑ دیا جائے۔ ایئرپورٹ پہنچا تو خلافِ توقع کسی قسم کی افراتفری اور مسافروں کی بھرمار نہیں تھی۔ بین الاقوامی ڈیپارچر لاؤنج تقریباً خالی تھا۔ امیگریشن وغیرہ کے معاملات سے فارغ ہو کر لاؤنج میں پہنچا۔ پہلی مرتبہ اپنے صحافی ہونے پر ذرا سا ناز ہوا کہ نہ تو کسٹمز والوں نے سامان چیک کیا اور نہ ہی امیگریشن والوں نے ۵۰۰ روپے نذرانہ طلب کیا جو اس سے پہلے دوبئی سعودی عرب اور دیگر ممالک جانے سے پہلے ادا کر چکا ہوں (زندگی میں پہلی مرتبہ پاسپورٹ پر اپنا اصل پیشے یعنی صحافت کا اندراج کرایا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے پرائیویٹ سروس یا بزنس والے سلسلے ہی چل رہے تھے) اس روز کراچی کا موسم بھی خلافِ معمول ابر آلود تھا اور کبھی کبھار ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ لاؤنج میں سیّد افضل حیدر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اُن کی دو بیٹیاں فریدہ اور فرح بھی ساتھ تھیں۔ دونوں سیاہ قباؤں میں ملبوس تھیں اور سیّد صاحب شاید اپنی بیلٹ گھر بھول آئے تھے، وہاں دونوں لاؤنج میں ہینڈی کرافٹس کی دُکان پر بیلٹ کی خریداری میں مصروف تھیں۔ ہم لوگ چائے کی میز پر جا بیٹھے۔ سیّد صاحب نے حال احوال پُوچھا تو میں نے

عارف حسین الحسینی کی شہادت کے بارے میں بتایا۔ سید صاحب پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں اور سیاست کے میدان کے بھی نامور کھلاڑی ہیں۔ وکالت میں بھی خاصا نام کمایا ہے اور اُن کا ایک خاص جوہر ایران کے سفر کے دوران مجھ پر کھلا کہ موصوف خاصے راسخ العقیدہ ہیں اور بظاہر "سوشلسٹوں" کے اِس گروہ سے اُن کا تعلق ہے جو شبِ عاشور موچی دروازہ کی گلیوں میں "ہائے حسینؑ" "ہائے حسینؑ" کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اِس خبر کو سُن کر اُن کی کیفیت بھی مجھ سے جُدا نہ تھی۔ فریدہ اور فرح بھی پریشان تھیں۔ سید صاحب سے جب کانفرنس کے بارے میں بات ہوئی تو اُنھوں نے بتایا کہ اسلام آباد سے ڈاکٹر فاروق حسنات بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ اس اثنا میں ڈاکٹر صاحب بھی آن ملے۔ خاصی متاثر کرنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ سیاسیات کے اُستاد ہیں۔ مَیں نے اُن کو غور سے دیکھا تو چہرہ کچھ جانا پہچانا معلوم ہوا۔ تعارف پر پتہ چلا کہ موصوف سید حسنات احمد (سابق ڈپٹی کمشنر) اور حالیہ ایم پی اے کے بیٹے ہیں (سید حسنات احمد سے میں ۱۹۶۴ء میں سیالکوٹ کے بہترین سکاوٹ کا انعام حاصل کر چکا ہوں، وہ ان دنوں سیالکوٹ میں ڈپٹی کمشنر تھے)

ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ آغا مرتضیٰ پویا دکھائی دیئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہمارے پاس ہی آ گئے۔ اُن کے بیٹھتے ہی ٹی وی پر انگریزی خبرنامہ شروع ہو گیا جس کی لیڈ کی خبر علامہ عارف حسین الحسینی کی شہادت کے بارے میں تھی۔ خبریں ختم ہوئیں تو اس واقعہ پر گفتگو شروع ہو گئی ابھی فلائٹ اناؤنس نہیں ہوئی تھی۔ پویا صاحب یوں تو پاکستان کے معروف انگریزی روزنامے کے مالک ہیں مگر اپنے حلیے بشرے سے مراقبہ کرنے والے صوفی دکھائی دیتے ہیں۔ گفتگو انتہائی پُراثر اور پُرزور انداز میں کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ کراچی سے کرنل غفار مہدی بھی ہمارے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے۔ کرنل غفار مہدی کو میں ایک فوجی ماہر کی حیثیت سے جانتا تھا اور اُن کی تحریریں پڑھ چکا تھا مگر اُن سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی یا اُن کی باوقار شخصیت سے متعارف ہوا۔ وہ گہرے رنگ کے بش سوٹ میں ملبوس تھے۔ عمدہ ریشمی سکارف باندھ رکھا تھا اور سر پہ پی کیپ تھی۔ گفتگو کے دوران بار بار اپنی ایستادہ مونچھوں کو تاؤ دیتے اور نہایت شستہ اُردو میں بات کرتے۔ گفتگو کے دوران

معلوم ہوا کہ موصوف کا تعلق لکھنؤ سے ہے اور اس سے پہلے بھی کئی بار ایران کا دورہ کر چکے ہیں بلکہ ایران میں فوجی مشیر کی خدمات بھی انجام دے چکے ہیں۔ ایران ایر کی فلائیٹ اناؤنس ہوئی اور ہم ہلکی ہلکی پھوار میں جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ یہ ۷۴۷ جمبو جیٹ تھا۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ تقریباً آدھی دنیا کا سفر کرنے کے باوجود ابھی تک جمبو کی پرواز کا لطف نہیں اُٹھایا تھا۔ جہاز میں داخل ہوتے ہی پہلی مسرّت یہ ہوئی کہ اکانومی کلاس کا ٹکٹ ہونے کے باوجود ہمیں جہاز کے اگلے حصّے میں (یعنی وہ حصّہ جو عموماً فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے مختص ہوتا ہے) بٹھایا گیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایران ایر کا اندرونِ ملک اور عالمی پروازوں میں کہیں بھی فرسٹ کلاس نہیں ہوتی۔ انقلابِ ایران کے بعد اس فرق کو بھی ختم کر دیا گیا ہے اور اب آپ ایک ہی کرایہ خرچ کر کے جہاز کے کسی بھی حصّے میں سفر کر سکتے ہیں تاہم اس مسرّت کے ساتھ فضائی میزبانوں کو دیکھ کر مایوسی بھی ہوئی۔ پرویز حمید سمیت ہمارے بہت سے دوستوں کا خیال یہ ہے کہ فضائی میزبان ہی وہ واحد مخلوق ہے جس کے سہارے طیّارے کے متوقع جھٹکوں کا صدمہ برداشت کیا جا سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس مخلوق کو دیکھ کر لگنے والے جھٹکے ہوائی جہاز کے جھٹکوں سے وزنی ہوں ڈاکٹر فاروق حسنات ایئرپورٹ پر کافی کھل چکے تھے اور میں تو خیر اس بات پر قطعی حیران نہیں تھا کہ ہم اچانک اتنے اچھے دوست کیسے بن گئے مگر ڈاکٹر صاحب بار بار اس بات کا اعادہ ضرور کر رہے تھے کہ آپ سے گپ شپ میں مزا آئے گا اور سفر اچھا گزرے گا۔ چنانچہ انہوں نے بھی دوستی کو ایک منزل آگے بڑھاتے ہوئے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ ایران ایر کی پردہ دار فضائی میزبانیں تو چلیں درست ہے مگر ہلکا پھلکا میک اپ ہوتا تو کیا مضائقہ تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب کی پریشانی اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی بڑھنے لگی تو میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب عورت کو فطری حُسن ہی سجتا ہے۔ دیکھیں ذرا میک اپ کے بغیر کتنی ڈیسنٹ لگ رہی ہیں۔ واہ کیا گریس فُل خواتین ہیں۔ سیاہ رنگ کے سکارفوں سے سر کو سلیقے کے ساتھ ڈھکے ہوئے اوور آل زیبِ تن کیے۔ اپنی تہذیب کا خوبصورت نقشہ پیش کر رہی ہیں۔ آپ اتنے مایوس نہ ہوں جہاز میں بمبئی سے آنے والے مسافر بھی تشریف فرما ہیں۔ ایک نظر ذرا اُدھر بھی دیکھ لیجیے۔ ایران ایر کی

یہ پرواز بمبئی سے براستہ کراچی ہمیں لے کر تہران جا رہی تھی۔ جہاز میں ہندو، سکھ اور دیگر مسافر بھی موجود تھے۔ ٹیک آف کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں اور ڈاکٹر فاروق حسنات ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ سیّد افضل حیدر اور اُن کی بیٹیاں جہاز کے پچھلے حصّے میں تھے، ہماری عقبی نشستوں پر ایک ادھیڑ عمر صاحب سُوٹ اور نکٹائی میں ملبوس اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ خاتون بھی اسی قسم کے پردے میں تھیں جو فضائی میزبان خواتین نے کر رکھا تھا۔ جہاز میں بیٹھے مسافروں پر ایک نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ کراچی سے سوار ہونے والی چند ایرانی خواتین اور دیگر پاکستانی خواتین بھی اسی طرح کے حجاب میں تھیں۔ پرواز کا اعلان ہوا تو ایک اہم درخواست نے ہمیں چونکا دیا۔ جہاز میں موجود خواتین سے کہا جا رہا تھا کہ ایران کے اسلامی قوانین اور ایران ایئر کے ضابطوں کے مطابق جہاز میں موجود تمام خواتین سے گزارش ہے کہ وہ اسلامی حجاب کر لیں اب مجھے اندازہ ہوا کہ سیّد افضل حیدر صاحب کی بیٹیاں کراچی ایئر پورٹ پر ہی بُرقعوں میں کیوں تھیں۔ اُنہیں شاید ان ضابطوں کا پہلے سے علم تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ قوانین اور ضابطے بنانے کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک اُن پر عمل نہ کیا جائے اور یہ عمل ہی ہے جو انسان کو ان ضابطوں کا پابند بناتا ہے اور ایک بار جو ضابطہ انسان کی زندگی کا جُزبن جائے تو پھر اُسے ترک کرنا خود انسان کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ جہاز نے ٹیک آف کیا تو ہماری اگلی نشست سے لائف جیکٹ ہمارے قدموں میں آ گری۔ اس سے پیشتر کہ مَیں اس پر کوئی تبصرہ کرتا ڈاکٹر صاحب اور کہنے لگے۔ شاہد صاحب مائنڈ نہ کیجئے گا۔ یہ ان کا حوصلہ ہے کہ آٹھ برس کی طویل جنگ کے باوجود یہ اپنی فضائی سروس کو بحال رکھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انہیں مینٹی ننس کے لیے نہ تو امریکہ پُرزے دیتا ہے اور نہ ہی تکنیکی مہارت مہیا کرتا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے فاضل پُرزے لے کر ایرانی ہوا باز اس سروس کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام آباد سے روانگی سے قبل ایرانی سفیر نے اُنہیں بار بار یہ کہا تھا کہ اگر کہیں آپ کی پذیرائی میں کوئی تھوڑی بہت کسر بھی رہ جائے تو درگزر کیجئے گا۔ یہ سوچ کر کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں اور ایک ایسی جنگ لڑ رہے ہیں جس میں ہمیں خدا کے سوا کسی طاقت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ فضائی میزبان رات کا کھانا لگا رہے تھے۔ خوشبو بتا رہی تھی کہ یہ کھانا اپنے ہی ہاں کا ہے

جب پیکنگ پر نظر پڑی تو بمبئی کی کسی کیٹرنگ فرم کا نام تھا۔ خاص طور پر سویٹ ڈش خاصی مزیدار تھی۔ یہ بمبئی ہی کی کسی مشہور سویٹ شاپ کے بنائے ہوئے بڑے بڑے گلاب جامن تھے۔ گرما گرم اور لذیذ، ایرانی جہاز میں بمبئی کے گلاب جامن کھانے کا اپنا ہی لطف تھا۔ یہ پذیرائی بہرحال مجھے بے حد اچھی لگی۔ فلائٹ خاصی ہموار تھی۔ کہیں کہیں ہلکا سا جھٹکا لگتا تھا اور بقول ڈاکٹر صاحب یہ جھٹکے نہ ہوں تو فضائی مسافروں کی تعداد دوگنا ضرور ہو جائے۔ کافی کے ساتھ ساتھ ایران کے معاملات پر بھی گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق چونکہ انسٹیٹیوٹ آف سٹریٹجک سٹڈیز پاکستان سے ہے اور وہ عالمی سیاسیات کے موضوع پر خاصی دسترس رکھتے ہیں اس لیے مَیں اُن سے اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ گفتگو کرنا چاہ رہا تھا تاکہ ان معلومات اور خیالات کی روشنی میں ایران کا دورہ مفید ترین بنا سکوں۔ تھوڑی دیر میں آغا مرتضیٰ پویا بھی آ گئے۔ وہ ہماری عقبی نشستوں پر بیٹھے مسافروں سے گفتگو کر رہے تھے انہوں نے ہمارا تعارف بھی ان سے کروایا۔ وہ ایران میں پاکستانی سفیر تنویر احمد، اُن کی اہلیہ اور بیٹا تھے۔ موصوف بڑی محبت سے پیش آئے۔ سفارت خانے آنے کی دعوت دی۔ اُن سے کانفرنس کے بارے میں بات ہوئی تب پتہ چلا کہ دفاع اور تجاوز AGRESSION AND DEFENCE کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس ہے جس میں پوری دنیا سے ۲۵۰ کے قریب سکالر اور صحافی شرکت کر رہے ہیں اور یہ ایرانی حکومت کی سیاسی پالیسی کا ایک حصہ ہے کہ ایک انٹرنیشنل فورم پر عراق کو جارح ثابت کیا جائے اور عالمی رائے عامہ کو عراق کے جنگی مظالم سے آگاہ کیا جائے۔ جہاز میں بھی علامہ عارف حسین الحسینی کے دفوعہ کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ سب لوگ اِس بات سے متفکر تھے کہ پاکستان میں بھی بیروت والے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت کی پالیسیوں کی ناکامیوں کا بھی تذکرہ تھا اور عوام کی بے بسی اور تخریب کاروں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں پر تشویش بے انداز تھی۔ کچھ تذکرے خلیج کی جنگ اور اس ساری صُورتِ حال میں پاکستان کے کردار کے بھی تھے۔ اِس ضمن میں سیاسی ماہرین کی رائے کچھ بھی ہو میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمیں کسی طرح بھی امریکی کالونی بن کر رہنا زیب نہیں دیتا۔ ایک طرف تو یہ اسلام کی رُوح کے منافی ہے کہ ہم یہودیوں کے دست نگر بن جائیں اور دوسری جانب

امریکہ کی دوستی ہمیشہ ہمارے لیے گھاٹے کا سودا رہی ہے جو سراسر ہمارے قومی تشخص اور ملّی وقار کے منافی ہے۔ جہاز محوِ پرواز تھا۔ ہم اپنی نشستوں کے اُوپر سے سر نکالے مصروفِ گفتگو تھے، ڈاکٹر حسنات احمد اور آغا مرتضیٰ پویا اپنی اپنی سیاسی بصیرت کا تبادلہ کر رہے تھے اور مَیں سوچ رہا تھا کہ بڑی طاقتیں نہ صرف قوموں کو جسمانی طور پر افراتفری میں مصروف رکھتی ہیں بلکہ ان کے دانشوروں کے دماغ بھی انہی معاملات میں اُلجھے رہتے ہیں اور وہ کوشش کے باوجود بھی نجات کی راہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ میں اپنی طبیعت کی بے چینی کی وجہ سے اپنی نشست سے اُٹھا۔ اور فلائٹ کے چیف سٹیورڈ سے تعارف کی کوشش کرنے لگا۔ یہ چالیس بیالیس برس کا ایک سُرخ سپید ایرانی تھا۔ چہرے پر تکان کے آثار نمایاں تھے اور وہ شُستہ لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے جہاز میں ہے۔ صبح یہی پرواز بمبئی گئی تھی۔ اب بمبئی سے واپس جا رہے ہیں۔ جنگ کے بارے میں بات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ اس صورتِ حال سے قدرے ناخوش تھا۔ تاہم اس نے بڑے محتاط انداز میں میرے سوالات کے جواب دیئے۔ وہ گزشتہ ۱۷ برس سے فضائی میزبان کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ اُسے اِس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کو وہ سہولتیں بہم نہیں پہنچا سکتا تھا جو دنیا کی دیگر فضائی کمپنیاں مہیا کرتی ہیں۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ مجھے کراچی سے دبئی تک امارات کی فلائٹ سے جانے کا اتفاق ہوا اور یہ بات میرے لیے حیران کُن تھی کہ امارات کی فرانسیسی میزبان اپنے بعض مہمانوں کو ہالینڈ کی بئیر کے یخ بستہ ٹن اور وِسکی کے منی ایچرز پیش کر رہی تھی۔ بہر حال بہتی گنگا میں دو ایک مرتبہ ہم نے بھی ہاتھ دھوئے مگر یہاں تو نقشہ ہی اُلٹا تھا۔ ہمارا چیف فضائی میزبان موازنہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور اس کا انداز بھی معذرت خواہانہ تھا۔ کراچی سے پرواز کیے ہوئے ہمیں تقریباً ۲ گھنٹے دس منٹ گزرے تھے کہ لینڈنگ اناؤنس ہوئی۔ کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو روشنیوں کا ایک سیلاب تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا اوہ میرے خدایا تہران کتنا بڑا شہر ہے۔ پھر میں اور ڈاکٹر صاحب کراچی سے تہران کا مقابلہ کرنے لگے ہمارے اندازے کے مطابق کراچی سے تہران دس گنا بڑا ضرور تھا۔ جہاز نے تہران کی زمین

کو چھوا تو ایک عجیب قسم کی طمانیت کا احساس ہوا ہیں اور ڈاکٹر صاحب تہران کو "روشنیوں کا شہر" قرار دے چکے تھے
جہاز سے بسوں میں بیٹھ کر ائیر پورٹ کی عمارت تک پہنچے تو ایک منظر میرے لیے خاصا پریشان کن تھا
کہ لوگ بس سے اُترتے ہی بھاگنا شروع کر دیتے۔ پہلے تو مجھے اس بات کی سمجھ نہ آئی مگر جب
امیگریشن ہال پہنچے تو اس بھاگ دوڑ کی افادیت کا پتہ چلا۔ امیگریشن کاؤنٹر پر ایک طویل لائن لگی تھی۔
ہم سب بھی اِس قطار میں شامل ہو گئے۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک صاحب پلے کارڈ اُٹھائے
ہال میں داخل ہوئے جس پر کانفرنس کا نشان بنا تھا۔ انہیں ہماری تلاش تھی۔ ان کے ساتھ ہلکی سی
داڑھی میں نظر کی عینک لگائے ایک گول مٹول سا نوجوان سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا
ہوا ہمارے ساتھ متعارف ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر فاروق حسنات اِس نوجوان سے پہلے ہی سے متعارف تھے۔
معلوم ہوا کہ یہ حسن بُوصراف ہیں اسلام آباد میں ایرانی نیوز ایجنسی ارنا کے سٹیشن ڈائریکٹر ہیں۔ حسن سے
مل کر اس لیے بھی خوشی ہوئی کہ وہ بھی ایک پیشہ ور صحافی ہیں۔ امیگریشن کاؤنٹر کے آگے لگی طویل قطار
سے نکال کر ہمیں وی آئی پی لاؤنج میں لے جایا گیا۔ جگہ جگہ گہرے سبز رنگ کی وردی میں ملبوس سمارٹ
اور چاق و چوبند گارڈ ہر آنے جانے والے پہ نظریں جمائے کھڑے تھے۔ وی آئی پی لاؤنج انتہائی
سادگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ دیواروں پر قرآنی آیات کے طغرے آویزاں تھے، ایک کونے میں میز پر
امام خمینی کی تصویر سجی تھی، علامہ منتظری، علی خامنائی اور رفسنجانی کی تصاویر بھی لاؤنج میں موجود تھیں۔
پاکستان اور ایران کے معیاری وقت میں تقریباً ۲ گھنٹے کا فرق ہے۔ جب ہم نے کراچی سے پرواز
کی تھی تو رات آٹھ بجے کا عمل تھا۔ لاؤنج میں پہنچے تو آٹھ بجکر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ ہم نے
اپنی گھڑیاں درست کیں۔ حسن کے ہمراہ دو اور کارکن بھی تھے جن کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ
ان کا تعلق ایران ائیر سے ہے۔ ہم سے پاسپورٹ لے لیے گئے تاکہ امیگریشن اور کسٹمز کے معاملات
سے نپٹا جا سکے۔ اگلے ہی لمحے چائے آ گئی۔ بغیر دُودھ کے چائے پینے کا یہ پہلا تجربہ تو نہیں تھا۔ دنیا
میں پاکستان سمیت بہت کم ممالک ہوں گے جہاں دُودھ کے ساتھ چائے پینے کا رواج ہے تاہم
چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اپنی دُودھ پتی بہت یاد آئی۔ لاؤنج میں پڑے ٹی وی پر ایک عالمِ دین

تقریر فرما رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ جمعہ کی نماز کا خطبہ ہے جسے صبح ریکارڈ کیا گیا تھا۔ ٹی وی پر جمعہ کی نماز کا اتنا بڑا ہجوم زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا۔ لاکھوں کی تعداد میں نمازی قطار اندر قطار بیٹھے خطبہ سن رہے تھے مجھے اپنے ہاں کے خطبے سننے کا بھی اتفاق ہوا ہے اور سعودی عرب اور خلیج کے دیگر مسلم ممالک میں بھی جمعہ کی نماز اور عیدین کے خطبے سُنے ہیں۔ ہمارے ہاں تو خیر ان خطبوں کا انداز ہی کچھ اور ہے۔ ہمارے علماء ان خطبوں میں دین کی خدمت کم اور فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا زیادہ دیتے ہیں۔ ہر کسی نے اپنے اپنے مسلک کی دُکانداری چمکا رکھی ہے۔ حالانکہ ایسے اجتماعات 'اخوت'، بھائی چارے اور محبت کی تبلیغ کے لیے خاصے اہم ہیں مگر نہ جانے یہ جذبہ ہمارے علماء میں کب پیدا ہوگا۔ سعودی عرب سمیت دیگر عرب ریاستوں میں ایسے مخصوص خطبے سرکاری طور پر جاری کیے جاتے ہیں اور کسی بھی مسجد کا امام اپنی طرف سے ان خطبوں میں ایک لفظ کا اضافہ یا کمی نہیں کر سکتا مگر یہاں ملکی اور عالمی حالات پر ایک پُر مغز تقریر ہو رہی تھی۔ دین کی عظمت کے ساتھ ساتھ فلسفہ شہادت اور عالمی امور پر بڑے فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی جا رہی تھی اور لاکھوں کا مجمع ہمہ تن گوش ان خیالات سے مستفیض ہو رہا تھا۔ ہمیں لاؤنج میں بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا مگر ابھی تک روانگی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہی کارکن واپس آئے ہم سے ہمارے سامان کی چابیاں طلب کیں۔ اُن کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے سیّد صاحب سے کہا کسٹمز والوں کی جانب سے یقیناً کچھ گڑبڑ ہے ورنہ چابیاں طلب نہ کی جاتیں۔ مرتضیٰ پویا بتانے لگے کہ یہاں کسٹمز کی بڑی سخت چیکنگ ہوتی ہے اور کسی کے ساتھ رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ساتھ لاؤنج میں کرناٹک بھارت سے آنے والے مہمان عبدالکریم بھی تھے۔ تعارف پر پتہ چلا کہ موصوف وہاں کے کسی کالج کے پرنسپل ہیں۔ وہ بھی ہماری ہی فلائٹ میں تھے۔ چابیاں گئے ہوئے بھی آدھ گھنٹے سے اُوپر کا وقت گزر گیا۔ کارکن پھر واپس آئے۔ اِس مرتبہ اُن کا کہنا تھا کہ ہم سے بکس نہیں کُھل رہے۔ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو ہمارے ساتھ کسٹمز کاؤنٹر پر چلیں اور ہماری مشکل حل کر دیں۔ یہ مناسب تجویز تھی۔ اس دوران ہم دو مرتبہ چائے پی چکے تھے اور اَب سب کے چہروں پر تھکاوٹ کے آثار بھی تھے۔ خواہش یہی تھی کہ جلد از جلد بستر کی

نرمی میسر آئے۔ ہم سب اُن کے ساتھ ہو لیے۔ اپنے اپنے سامان کی شناخت کرائی اور کافی تگ و دو کے بعد ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکلے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وزارتِ ارشاد کے افسر ارنا والے اور ایران ایئر کے کارکن کسٹمز والوں کے ضابطوں کے آگے خاصے بے بس ہیں۔ وزیٹرز لاؤنج میں عوام کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ ہمیں وی آئی پی لاؤنج ہی میں کانفرنس کا نشان جس پر ہمارے نام اور ملک کا نام کندہ تھا مہیا کر دیا گیا تھا جسے ہم سب نے نمایاں طور پر اپنے سینوں پر سجا لیا تھا۔ وزٹرز لاؤنج میں موجود لوگ ہمیں خاصے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ پھولوں کی طرح کھلے ہوئے خوش و خرم چہرے، بہت سوں کے ہاتھ میں پھولوں کے گلدستے تھے اور وہ یقیناً اپنے پیاروں کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ ہمیں عوام کے اس ہجوم میں سے راستہ بنا کر ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکالا گیا۔ جہاں ہمارا سامان گاڑیوں میں لادا جا رہا تھا۔ ہمیں ویگنوں میں سوار کرایا گیا۔ آگے دو مستعد پائیلٹ موٹر سائیکلوں پر سوار ہمارے لیے راستہ بناتے ہوئے جا رہے تھے۔ یہ سب اہتمام دیکھ کر ایک فوری خیال میرے ذہن میں آیا کہ اگر اہتمام اور انتظام کا یہی عالم رہا تو ہم محض وی آئی پی بن کر رہ جائیں گے اور شاید ہمیں ایران کے گلی کوچوں اور مارکیٹوں میں عام لوگوں سے ملاقات کا موقع ہی نہ ملے۔ اِن حالات میں تو ایک صحافی کے لیے صورتِ حال کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ ہماری گاڑیاں تہران کی صاف شفاف اور کشادہ سڑکوں پر رواں دواں تھیں۔ کاروں کا ایک سیلاب تھا جو پیشِ نظر تھا۔ سڑکیں منوّر تھیں اور جا بجا کانفرنس کا نشان بجلی کے کھمبوں پر آویزاں تھا جس طرح ہمارے ہاں مختلف مشروبات کے نیون سائن آویزاں ہوتے ہیں۔ ایئرپورٹ سے ہوٹل تک کا فاصلہ تقریباً ۲۵ منٹ میں طے ہوا۔ سڑکوں پر زندگی کو اس طرح رواں دواں دیکھ کر خاصی حیرت بھی ہوئی۔ ہمارے خیال میں تو یہاں بلیک آؤٹ ہونا چاہیئے تھا۔ گاڑیوں کی بتّیوں پر سیاہ کاغذ اور لوگ گھروں میں ڈرے، دبکے اور سہمے ہوئے۔ ہم نے تو دورانِ جنگ اسی قسم کی صورتِ حال دیکھی تھی۔ یا خدا یہ قوم جنگ لڑ رہی ہے۔ سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب میں نے ایک خاتون کو کار چلاتے ہوئے دیکھا۔ مَیں نے ڈاکٹر حسنات احمد کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی اور پھر ہم

دونوں ہوٹل پہنچنے تک خواتین ڈرائیوروں کی تعداد گنتے رہے۔ سروں کو سکارفوں سے ڈھانپے۔ ایک ہی طرح کے لباس میں ہم اب تک بیسیوں ایرانی خواتین کو دیکھ چکے تھے۔ مجھے معاً اپنا سعودی عرب کا چھ ماہ کا قیام یاد آیا جس کے دوران میں نے کسی بھی عورت کو کار چلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں تو کار میں بیٹھی ہوئی عورت بھی کبھی کبھار دکھائی دیتی تھی اور مجھے امجد بھائی نے بتایا تھا کہ چند برس پہلے تک تو سعودی عرب میں کسی عورت کو کار کی اگلی نشست پر بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ خیر اس بات کا اطمینان تو ہوا کہ عورتوں کو گھروں میں پابند کرنے والی بات محض پراپیگنڈہ ہے۔

ہوٹل کی عمارت خاصی بلند و بالا اور شاندار تھی۔ جس پر" ہوٹل آزادی بزرگ" کے الفاظ نمایاں تھے انگریزی میں اس ہوٹل کا نام آزادی گرینڈ ہوٹل تھا۔ ہوٹل کی عمارت کے بالکل سامنے ایکڑوں میں پھیلا ہوا ایک میدان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا جس کے باہر" شہر بازی" کے الفاظ روشن تھے۔ سید افضل حیدر نے بتایا کہ فارسی میں اس کا مطلب کھیلوں کا شہر ہے۔ یہ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا جوائے لینڈ کی طرز کا ایک شہر ہے جس میں بچوں کی تفریح کے لیے طرح طرح کے کھیل تماشے موجود ہیں اس کے بارے میں جانتے ہی اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر فی الحال اس خواہش کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ ہوٹل کے مین گیٹ پر فارسی میں ایک تحریر جلی حروف میں موجود تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس ہوٹل میں اسلامی حجاب کا خیال رکھا جائے۔ اس سلسلے میں ہم کوئی بھی رعایت دینے سے معذرت خواہ ہیں۔ یہ تحریر پڑھ کر مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہاں جو کہا جاتا ہے وہ کیا بھی جاتا ہے۔ ہوٹل کی ٢٦ منزلہ عمارت میں داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت لابی ہے۔ جس میں ایرانی قائدین کی تصاویر نمایاں طور پر آویزاں ہیں۔ ہم سب کو ٢٠ ویں منزل پر کمرے دیئے گئے۔ یہ ہوٹل انقلاب ایران سے پہلے حیات ریجنسی تھا جو بین الاقوامی ٥ سٹار ہوٹلوں کی ایک امریکی چین ہے۔ مگر انقلاب کے بعد اس ہوٹل سمیت دیگر فائیو سٹار ہوٹلوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ قومی ملکیت میں لینے کے بعد ان تمام ہوٹلوں کو معذوروں کے قومی ٹرسٹ کے حوالے کر دیا گیا جن کی ساری آمدنی معذوروں، یتیموں اور بیواؤں کے سرکاری ویلفیئر فنڈ میں جاتی ہے۔ ہوٹل کے کمرے خاصے کشادہ اور

امریکیوں کے طرزِ تعمیر کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ اتفاق سے میرے کمرے کی کھڑکی ایک خوبصورت پہاڑ کی جانب کھلتی تھی اور کمرے میں قیام کے دوران جب کبھی میں نے کھڑکی کے پردے کو ہٹایا۔ مجھے یوں لگا جیسے پہاڑ کی چوٹی میرے کمرے کے بالکل برابر ہے۔ کمرے میں شیخ سعدی کی ایک حکایت ایرانی خطاطی میں آویزاں تھی جس کا ترجمہ یہ ہے: "یہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا کہ کوئی راہِ راست پر چل رہا ہو اور بھٹک جائے"۔ ٹی وی کا سوئچ آن کیا تو علامہ عارف حسین الحسینی کے بارے میں پروگرام چل رہا تھا۔ ایرانی حکومت نے علامہ کی شہادت پر تین روز کا سرکاری سوگ منانے کا اعلان کیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایئرپورٹ سے ہوٹل آتے ہوئے راستے میں کئی سرکاری عمارات پر میں نے ایرانی پرچم سرنگوں دیکھا تھا اور ہوٹل کے باہر بھی ایرانی پرچم سرنگوں تھا۔ ایران میں بیشتر اخبارات شام کو شائع ہوتے ہیں۔ مگر جمعہ کے روز اخبارات کی چھٹی ہوتی ہے۔ تمام اخبارات نے سانحہ پشاور کی خبر اگلے روز جلی سرخیوں میں شائع کی تھی اور معمول کی اشاعت میں علامہ کے بارے میں خصوصی مضامین کے علاوہ ایرانی قائدین کے بیانات بھی شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیے گئے تھے۔

حسن پوصراف سمیت جتنے بھی ایرانی ملے سب نے علامہ کے واقعہ کے بارے میں ضرور پوچھا اور ہمارے ساتھ افسوس کا اظہار کیا کہ ایک اتنا جیّد عالم اور اتحاد بین المسلمین کا داعی یقینی طور پر مذہبی منافرت کا شکار ہو گیا۔ رات کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ جب میں ہاتھ منہ دھو کر ہوٹل کی لابی میں پہنچا۔ گرما گرم کافی پینے کا انتہائی موڈ ہو رہا تھا۔ حسن نے بتایا کہ ہفتہ میں چونکہ ایران ایئر کی صرف ایک ہی فلائٹ پاکستان سے آتی ہے اور ایک ہی تہران سے کراچی جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں کانفرنس کے انعقاد سے تین روز پہلے تہران بلا لیا گیا ہے۔ کانفرنس اسی ہوٹل میں ۸ اگست سے ۱۰ اگست تک ہو گی۔ اور دیگر مندوبین ۷ اگست کی شام تک تہران پہنچ جائیں گے۔ ہوٹل میں کانفرنس کی تیاریاں جاری تھیں۔ ایران ایئر کے علاوہ کانفرنس سیکرٹریٹ بھی لابی بھی قائم کر دیا گیا تھا۔ مگر ابھی تک پروگرام کی کاپیاں ہمیں مہیا نہیں کی گئی تھیں۔ لابی میں آیا تو خواتین اور بچوں کا ایک ہجوم دیکھ کر ٹھٹکا۔ معلوم ہوا کہ بارات آ رہی ہے۔ شادی کی رنگارنگ تقریب ہے۔ ویٹر کو کافی کا آرڈر دیا اور لابی میں پڑے ایک

آرام دہ صوفے میں دھنس گیا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر فاروق حسنات، سید افضل حیدر، کرنل غفار مہدی اور پاکستان سے آئے ہوئے پانچویں مندوب ڈاکٹر محمود الرحمٰن فیصل جن کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ لابی میں آگئے۔ اُن سے تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ وہ تحریکِ انقلابِ اسلام کے کنوینر ہیں اور ٹینچ بھاٹا راولپنڈی میں کلینک کرتے ہیں۔ دلہن فرانسیسی طرز کے سفید لباس میں ملبوس تھی اور دولہا نے چمکدار قسم کا کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایران میں کوٹ پتلون کے ساتھ ٹائی کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ بچوں اور عورتوں کے چہروں پر وہی ہمارے ہاں والی مخصوص خوشی تھی جو شادی بیاہ اور خوشی کے ایسے موقعوں پر ہوتی ہے۔ پھر نکاح ہوا، کھانا ہوا اور گھر والے ہنستے مسکراتے دولہا دلہن کو اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں چھوڑ کر رُخصت ہو گئے۔ نہ رُخصتی کا گیت، نہ سہیلیوں کا رونا، نہ ماں باپ کی آنکھوں میں نمی۔ کرنل صاحب نے بتایا کہ ایرانیوں کے ہاں بیٹی کی شادی بھی خوشی کا موقع ہے اور وہ اِس موقع پر ہماری طرح محرم بپا نہیں کرتے۔ بارات والے رخصت ہو گئے۔ اور ہم دیر تک باتیں کرنے کے بعد کمروں میں واپس پہنچ گئے۔ سارا دن سفر میں گزرا تھا، تکان اتنی تھی کہ خود بخود بستر کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ بستر پر گرتے ہی نہ جانے کب نیند کی آغوش میں جا پہنچے۔

فریدہ اور فرح امریکی اور ایرانی خواتین کے ساتھ

تہران کی اکبری منڈی

خلافِ معمول نہ جانے کب تک سویا رہتا کہ دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک نے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دروازہ کھولا تو سیّد افضل حیدر نہائے دھوئے، تازہ دم دروازے پر کھڑے تھے کہنے لگے " پا'جی سونے کے لیے نہیں آئے، اُٹھ جائیے کچھ کرنسی وغیرہ کے معاملات بھی نمٹانے ہیں اور بھوک بھی زوروں کی لگ رہی ہے۔ آج ہی شہر کی سیر کر لیتے ہیں، کانفرنس شروع ہو گئی تو پھر نکلنا مشکل ہوگا" شاہ جی کو حوصلہ دے کر بھاگم بھاگ غسل خانے میں گُھس گیا۔ تیار ہو کر کافی شاپ میں پہنچا۔ ناشتہ چل رہا تھا۔ ہمارے ساتھ کینیا سے آئے ہوئے ایک غیر مسلم سکالر بھی ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ اُن سے گفتگو چلی تو معلوم ہوا کہ وہ ایران کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ عالمی امور پر بہت تُلی گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ اگر عراق ایران جنگ بند ہو جائے تو یہ قوم بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کرے گی کیونکہ لوگوں کی اکثریت انقلابِ ایران کے ساتھ کومیٹڈ ہے۔ ابھی تو تیل کی برآمد بھی بند ہے۔ اقتصادی حالات خراب ہیں۔ تجارت کا بُرا حال ہے اور اس کے باوجود لوگ سُکھ اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے سوال کیا " آپ نے رات سے اب تک کہیں کوئی افراتفری، کوئی ہلچل، کوئی بھاگ دوڑ دیکھی ہے۔ لوگ ہر کام معمول کے مطابق کر رہے ہیں، کسی طرح بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ قوم گزشتہ آٹھ برس سے جنگ لڑ رہی ہے۔"

"آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟" میں نے اُلٹا سوال کیا۔

"قیادت کا معجزہ، مَیں تاریخ کا اُستاد ہوں، مَیں جانتا ہوں کہ قیادت بھی کیا کیا معجزے دکھاتی ہے۔ آپ کا مذہب اس لیے پاپولر ہوا تھا کہ آپ کو محمدؐ کی صورت میں ایک بے لوث قائد میسّر آگیا تھا، جس کے قول اور فعل میں تضاد مغربی نقّادوں کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا اور آپ تو جانتے ہوں گے کہ لوگ عرب کے اس ایک شخص کے بارے میں آنکھ بند کر کے قسمیں کھایا کرتے تھے۔ ایرانی قوم بڑی خوش نصیب ہے۔ یہاں کی قیادت بڑی بے لوث ہے ورنہ ان کا چند ماہ گزارنا بھی مشکل تھا۔

میز پر ایرانی تنوری روٹی کے سلیقے سے کاٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک ٹوکری میں رکھے تھے اور ہم ابھی اسی نمکین روٹی سے شغل کر رہے تھے، ویٹر اسی اثنا میں تازہ جوس کے گلاس، پنیر کا پیالہ، جام اور مکھن لے آیا۔ اب وہ انڈوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں ہماری رائے معلوم کر رہا تھا۔ میں نے تو انڈوں کی پذیرائی سے معذرت کر لی مگر مجھے حیرت اس وقت ہوئی جب سیّد افضل حیدر نے بڑے دھوم دھڑکے سے فُل فرائڈ انڈوں کا آرڈر دیا۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ شاہ جی اوپن ہارٹ سرجری کروا چکے ہیں اور کیلسٹرول ان کے لیے یقینی طور پر نقصان دہ ہو گا مگر صاحب پنیر، مکھن اور انڈوں کے علاوہ شاہ جی گولڈ لیف سے بھی پورے طور پر لطف اندوز ہونا اپنا حق سمجھ رہے تھے اور ہمارے ایران قیام کے دوران یہ حق انہوں نے میرے فرح اور فریدہ کے بارہا ٹوکنے کے باوجود کُھلے عام استعمال کیا۔ افریقی سکالر جو اب تک ہمارے ساتھ کُھل مِل گیا تھا۔ اس صُورتِ حال سے خاصا لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے جُوس سے شغل کرتے ہوئے گفتگو کو جاری رکھا۔

"آپ کے خیال میں اس انقلاب کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے؟"

"کومٹمنٹ۔ جو قومیں مقاصد کے ساتھ کومیٹڈ ہوتی ہیں، ناقابلِ تسخیر ہو جاتی ہیں"۔ فریدہ اور فرح کو ہماری گفتگو سے تو شاید اتنی دلچسپی نہ تھی مگر وہ اس صورتِ حال سے ضرور لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ میز کی ایک جانب مَیں اور افریقی سکالر بیٹھے تھے اور دوسری جانب ڈاکٹر فاروق حسنات اور شاہ جی یوں بلیک اینڈ وائٹ کا اچھا خاصا تضاد آمنے سامنے تھا۔ مجھے آج تک افریقیوں کے اس

ذوق کی سمجھ نہیں آئی کہ ایک تو بیچارے رنگ کے حوالے سے ہوتے ہی گاڑھے ہیں اور اُوپر سے لباس اتنا شوخ پہنتے ہیں کہ سارا کومبینیشن گہرا ہو جاتا ہے۔ حساب کتاب کے معاملے میں ہمیشہ ہی سے اناڑی رہا ہوں حالانکہ میٹرک میں حساب میں سو فیصد نمبر حاصل کیے تھے مگر افسوس کی بات ہے کہ میٹرک والی قابلیت عملی زندگی میں کبھی کام نہ آئی۔ پاکستان سے میں نے ۶۴۰ ڈالر جاری کروائے تھے بعض سفری دانشوروں کا خیال تھا کہ یہ ضرورت سے بے حد زیادہ ہیں۔ کیونکہ ہوٹل اور دیگر اخراجات تو بہرحال کانفرنس کے منتظمین کو برداشت کرنا تھا مگر میں چونکہ آوارہ گردی کے ساتھ ساتھ ایران میں مقدّس مقامات کی زیارت کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس لیے مجھے یہ ۶۴۰ ڈالر بالکل کم لگ رہے تھے ہوٹل میں موجود بنک ملی کی برانچ سے ڈالر کا ایرانی کرنسی سے تبادل پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک ڈالر کے ۷۰ ریال یعنی ۷ تومان ملیں گے پھر ایک نظر میز پر پڑے مینو کارڈ پر ڈالی تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بغیر دُودھ کی چائے کا پیالہ ۸۰ ریال یعنی ۸ تومان کا تھا۔ دوسری نظر چاول اور کباب کی ڈِش (چلو کباب) کے نرخ پر پڑی تو طوطوں کے ساتھ ساتھ بلیاں بھی غائب ہو گئیں۔ ۱۸۰۰ ریال یعنی ۱۸۰ تومان ایک پلیٹ کا نرخ تھا ۔ ۷ تومان فی ڈالر سے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اگر کہیں اپنی جیب سے کھانا پڑا تو کم سے کم ۲۵ ڈالر میں ایک وقت کا دوزخ بھرے گا۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے شاہ جی نے ہمارے چہرے پر اُڑنے والی ہوائیاں دیکھ کر ہمیں حوصلہ دیا اور کہنے لگے "گھبراتے کیوں ہو ہم جو ہیں" ناشتے سے فارغ ہو کر لابی کی جانب آئے۔ پروگرام" اندرون شہر جانے کا بن رہا تھا۔ شاہ جی کا خیال تھا کہ ٹیکسی لے لی جائے مگر ڈاکٹر فاروق حسنات بضد تھے کہ بھئی آخر ہم یہاں مہمان ہیں اور جہاز میں ایمبسڈر صاحب نے ہماری مہمان نوازی کا وعدہ کیا تھا۔ میں ابھی فون کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب فون کرنے کی کوشش کرنے لگے اور جب یہ معلوم ہوا کہ علامہ عارف حسین الحسینی کے تین روزہ سرکاری سوگ کے ساتھ ساتھ آج سرکاری تعطیل بھی ہے تو خاصی مایوسی ہوئی۔ شاہ جی نے ایک اور ریفرنس دیا کہ خانۂ فرہنگ ایران لاہور کے سابق ڈائریکٹر علی آدرسجی کہتے ہیں کہ وہ ہماری مہمان نوازی کا شرف حاصل کریں مگر وہ بھی کسی سرکاری محکمے ہی میں ہیں لہٰذا اُن کا ملنا بھی

مشکل تھا۔ مَیں بار بار شاہ جی سے کہہ رہا تھا کہ آخر ایسا کیا مسئلہ ہے ٹیکسی کیوں نہیں لے لیتے۔ بالآخر شاہ جی کہنے لگے ذرا لابی میں موجود کاؤنٹر سے ٹیکسی کا معلوم تو کیجئے۔ میں فوراً کمر باندھ کر ٹیکسی کا پوچھنے چلا۔ اور اَب طوطوں اُور بلیوں کے بعد کتوں کی باری تھی جو ٹیکسی کا نرخ پوچھتے ہی فیل ہو گئے ہم سے انتہائی رعایت کے بعد ۲۰۰۰ ریال کا مطالبہ تھا یعنی ۲۰۰ تومان میں فوراً واپس بھاگا اور شاہ جی کو ٹیکسی کے نرخ سے آگاہ کیا۔ کہنے لگے " پا جی ہُن سناؤ " خیر جانا تو تھا ہی۔ ہم پیلے رنگ کی ایک بڑی سی شیورلیٹ میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور ۵۰ برس سے زائد عمر کا تھا مگر اپنی اچھی صحت کی وجہ سے ہمارا ہی ہم عمر لگتا تھا۔ اس کے انگریزی بولنے کے سٹائل سے پتہ چلتا تھا کہ ایک عرصے سے فائیو سٹار ہوٹل میں ٹیکسی چلانے کا دھندا کر رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایران میں بس کا سفر انتہائی سستا ہے۔ آپ ایک تومان یعنی ۱۰ ریال دے کر تہران بھر میں جہاں جی چاہے جا سکتے ہیں مگر ظاہر ہے بسیں فائیو سٹار ہوٹلوں کے مہمانوں کے لیے نہیں ہوتیں یہ تو غریب غربا کا شوق ہے جو تہران میں آپ کو خال خال ہی ملیں گے۔ پُورے تہران میں دو طرفہ سڑکوں کا جال ہے۔ انتہائی کشادہ اور صاف ستھری سڑکیں جن پر ہر وقت تیز ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔ مَیں شہر کی خوبصورتی اور عمارتوں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں پہاڑی ٹیلے بھی تھے جن پر کئی منزلہ فلیٹ تعمیر کیے گئے ہیں، بہت سی جگہوں پر اوور ہیڈز بھی تعمیر کیے گئے ہیں مگر ٹریفک کا رش دیکھ کر مجھے یہ اوور ہیڈز بھی ناکافی معلوم ہوئے۔

ایک بات جو ہم سب نے نوٹ کی وہ تیز رفتاری تھی، ایران کے لوگ بہت تیز رفتار ہیں اور ظاہر ہے تیز رفتاری میں احتیاط کا عنصر کم ہی ہوتا ہے۔ ہوٹل سے مرکز شہر جاتے ہوئے مجھے تہران کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ ہمیں خیابان امیر وکبیر (جسے آپ تہران کا دہلی دروازہ یا اکبری منڈی کہہ سکتے ہیں) پہنچنے پر ۴۵ منٹ کا وقت لگا۔ ٹیکسی مسجد سراج الملک کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پوری سڑک اکبری منڈی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب پھلوں کے ٹھیلے، سبزیوں کی ریڑھیاں اور گاڑیوں کے سپیئر پارٹس کی دُکانیں تھیں۔

شاہ جی اپنے کسی پاکستانی دوست کا پتہ پُوچھنے لگے۔ قریب ہی مہر ہوٹل تھا۔ یہ صاحب وہیں مقیم تھے۔ شاید فواد نام تھا۔ معلوم ہوا کہ فواد صاحب تو کاروبار کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر گئے ہیں۔ اُن کے دوست ریاض صاحب موجود ہیں۔ ریاض صاحب بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ چائے اور خشک میووں سے ہماری تواضع کی۔ اُن کے ہمراہ سیالکوٹ کے ایک دوست بھی تھے۔ تعارف ہوا تو اُنھوں نے خاصی پذیرائی کی۔ ریاض صاحب نے ہمیں ساتھ لیا اور ہم خیابانِ فردوسی آگئے۔ یہاں عجیب منظر پیشِ نظر تھا۔ ہر دوسرا آدمی کرنسی کے تھیلے ہاتھ میں اُٹھائے " دولر" " دولر" پُکار رہا تھا۔ ریاض صاحب نے بتایا کہ یہاں سے آپ دنیا جہان کی کرنسی تبدیل کر سکتے ہیں۔ مَیں حیران تھا کہ لبِ سڑک کرنسی کا کاروبار ہو رہا ہے۔ کیا یہ غیر قانونی نہیں ؟ " بالکل ہے" ریاض صاحب بولے " مگر کیا کریں یہ ان کی مجبوری ہے۔ جنگ کی وجہ سے یہ سب کرنا پڑ رہا ہے" " مگر حکومت ان کو پکڑتی نہیں۔ کیا یہ سب ان کے علم میں ہیں" میں نے استفسار کیا۔

" علم کیوں نہیں، مگر مجبُور ہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو جو تھوڑی بہت تجارت ہے ختم ہو جائے۔ آپ نے دیکھا نہیں دُنیا کی کوئی ائیرلائنز یہاں نہیں آتی، درآمد، برآمد سرے سے ہوتی ہی نہیں، تیل ویسے نہیں جا رہا مگر ضرورت کی ہر شے ایران میں موجود ہے۔ یہ سب نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے" ریاض صاحب کہہ رہے تھے اور مَیں سوچ رہا تھا کہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے کیا کیا حیلے کرنے پڑتے ہیں۔ ہم نے ڈالر کا نرخ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک ڈالر کے ۶۷۰ ریال یعنی ۶۷ تومان ملیں گے۔

یہ اطلاع اتنی خوش کُن تھی کہ اس پر دو تین بار ہپ ہپ ہُرّا کہا جا سکتا تھا مگر خوشی کا یہ اظہار برمحل نہ لگا لہذا خاموشی سے ڈالر دے کر ایرانی ریال سمیٹنے لگے۔ آپ اس وقت کی مسّرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب ۲۴۰ ڈالر کے عوض ایک لاکھ ساٹھ ہزار آٹھ سو ایرانی ریال واسکٹ کی جیبوں میں نہیں آ رہے تھے۔ چشم زدن میں لکھ پتی ہونا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ تہران کے بازاروں میں گھومنے کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ بھُوک چمک اُٹھی اور دوسرے یہ ہم بہت سی جگہوں کے ناموں سے واقف ہو گئے، مثلاً میدانِ خمینی، میدانِ فردوسی، میدانِ حافظ وغیرہ۔ میدانِ حافظ میں حافظ کا مجسمہ نصب تھا جبکہ

میدانِ فردوسی میں فردوسی کا مجسمہ ایستادہ تھا۔

پاکستان سے روانہ ہوئے تھے تو کاٹن کے علاوہ کوئی اور کپڑا برداشت سے باہر تھا مگر یہاں شلوار سُوٹ کے ساتھ واسکٹ بھی قابلِ برداشت تھی۔ اِس سے آپ تہران کے موسم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کوئٹہ کی طرح کا خشک موسم تھا۔ ہوا میں ہلکی سی نمی جو رات کو خاصی خوشگوار محسوس ہوتی تھی۔ تہران کے اِس حصے میں آکر معلوم ہوا کہ ہمارا قیام اِس علاقے میں ہے جو تہران کے امیر ترین باسیوں کا علاقہ ہے۔ اِن میں سے اکثر لوگوں کے بحیرہ کیسپئن پر اپنے بنگلے ہیں جو شاہ کے دَور سے امارت کی نشانی سمجھے جاتے ہیں۔ شاہ جی تو مزے سے گولڈ لیف اُڑا رہے تھے مگر ہمیں اپنے ہاں کی طرز کی شیشوں سے جگمگاتی ہوئی پان سگریٹوں کی کوئی دُکان دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ البتہ مین روڈ پر مختلف چوکوں میں نوعمر لڑکے اور بُوڑھے سگریٹوں کے کارٹن رکھے آنے جانے والوں کی خدمت میں مصروف تھے۔ یہ بات بھی میرے لیے حیرت سے کم نہ تھی کہ پُورے ایران میں صرف ایک ہی برانڈ کا سگریٹ (تیر) پیا جاتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اور مزدور سے لے کر افسر اور صاحبانِ حیثیت تک سب ایک ہی برانڈ پیتے ہیں۔ یہی ایک برانڈ ایران میں بنتا ہے اور اگر آپ کو سینہ جلانے کا شوق ہے تو ایک ہی طرح کے دھوئیں اور ٹار سے یہ کام ہوگا۔ اوّل تو درآمدی برانڈ میسّر ہی نہیں اور اگر آپ غیر ملکی سگریٹوں کے دھوئیں سے ایران کی فضا مکدّر کرنا چاہیں تو شاید ڈپلومیٹس پر تو اس کی پابندی نہ ہو ایرانی شہری اس پابندی سے آزاد نہیں ہیں۔ شاہ جی اسی وجہ سے مطمئن تھے وہ اس بات سے آگاہ تھے اور اپنے ساتھ اپنے برانڈ کا کارٹن لے کر آئے تھے۔ بھوک کی شدت کم کرنے کے لیے سڑک پر لگے ٹھیلے والے سے جوس پینے کی ٹھانی۔ اس کے پاس تین طرح کے جوس تھے گاجر، بیری اور خربوزہ بیری کے جُوس کا رنگ چونکہ میرے پسندیدہ مشروب سے کافی ملتا جلتا تھا اس لیے سیدھے ہاتھ سے ایک گلاس اُٹھا کر منہ کو لگا لیا۔ تُرشی اور مٹھاس کا یہ مزیدار ملاپ جی کو بے حد اچھا لگا۔ قیمت پوچھی ٹھیلے والے نے ہاتھ سے دو کا اشارہ کیا۔ بہت خوش ہوئے کہ صرف ۲ تومان ۲۰ ریال میں اتنا مزیدار جُوس، تومان کے سکّے اس کے حوالے کیے تو وہ ہنسنے لگا۔

اُب رہ ہمیں سمجھا رہا تھا اور ہم سمجھ رہے تھے۔ بات پیسوں کی تھی چنانچہ وہ جلدی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا مگر ہماری سمجھ میں دیر سے آئی اور اس وقت بالکل سمجھ میں آگئی جب ۲۰۰۰ ریال یعنی ۲۰ تومان کے نوٹ اس کی خدمتِ اقدس میں پیش کیے۔ (ایران کی بُنیادی کرنسی ایرانی ریال ہے۔ کرنسی نوٹوں اور سکوں پر یہی درج ہوتی ہے مگر لین دین میں ہمیشہ تومان پُکارا جاتا ہے۔ ایک تومان ۱۰ ایرانی ریالوں کے برابر ہے) ٹیکسی والے سے دوبارہ ۲۰۰۰ ریال میں معاملہ طے ہوا اور ہم ہوٹل آزادی بزرگ پہنچ گئے کمروں میں جانے کا ہوش کِسے تھا۔ سیدھے ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ لنچ کا مینو کارڈ آیا تو اس پر دُنیا جہان کے کھانے درج تھے۔ ایرانی چلو کباب، بختیاری کباب، چکن کباب، چکن باسکٹ، شرمپ ٹراڈ۔ اور نہ جانے کیا کچھ مگر ہماری نگاہ جہاں آکر ٹھہری وہ کیوی آر (CAVIAR) اِس خاص ڈش کا تذکرہ میں نے زندگی میں پہلی بار صادقین مرحوم کی زبانی سُنا تھا۔ اُنہوں نے بتایا تھا کہ بحیرہ کیسپئن میں پائی جانے والی ایک خاص قسم کی مچھلی کے انڈے ہوتے ہیں جنہیں ٹوسٹ پر مکھن لگا کر اور اس پر رکھ کر کھایا جاتا ہے وہ اس ڈش سے اپنے پیرس میں قیام کے دوران لطف اندوز ہو چکے تھے۔ شاہ جی سے اس پر گفتگو ہوئی تو بولے کہ تازہ ہو تو کیا بات ہے مگر ویٹر کی زبانی یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ کیوی آر آوٹ آف سٹاک تھی۔ میری دوسری ترجیح شرمپس یعنی جھینگے تھے۔ ویٹر نے سلاد کے بارے میں پوچھا۔ میں نے سمجھا ہماری طرح کا ہی سلاد ہو گا۔ کھیرے کے چار ٹکڑے، ۵ ٹکڑے ٹماٹر، ایک آدھ لیموں اور بہت سا پیاز مگر اس موقعہ پر شاہ صاحب اچھے گائیڈ ثابت ہو رہے تھے

لنچ کا وقت تقریباً ختم ہونے کو تھا لھذا ریسٹورانٹ میں زیادہ رش نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ویٹر سلاد کی پلیٹس لے آیا۔ شاہ جی بولے ٹوٹ پڑو یہ سلاد کھانے کے لیے نہمیز (APETIZER) کا کام دے گا۔ بڑا ہی مزیدار سلاد تھا۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ایران کے قیام کے دوران اگر میں بھی جذبہ جہاد سے کام لیتے ہوئے خوراک میں صرف سلاد پر ہی اکتفا کرتا تو ہر ماہ کیلسٹرول کا لیول چیک کرانے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ ایرانی خوراک کے معاملے میں خاصے "شاہ صفت" واقع ہوئے ہیں۔ کھانے کے ساتھ مشروبات ضرور لیتے ہیں اور چائے اور کافی میں دُودھ ملانا ان دونوں مشروبات

کی ہتک تصور کرتے ہیں۔ ویٹر نے مشروبات گنوائے۔ ایک نام بیئر کا بھی آیا۔ یہ نام سنتے ہی میرے دونوں کان غیر ارادی طور پر کھڑے ہو گئے مگر جب ویٹر نے دیگر مشروبات کے ساتھ بیئر پلیٹش کی تو " سارا گلہ جاتا رہا " یعنی وہ بھی سعودی بیئر کی طرح عین اسلامی تھی یعنی نشہ آور اجزا سے پاک، خالص جَو کا پانی۔ تہران کا پانی بھی دیگر پہاڑی مقامات کی طرح معدنی ہے مگر یہاں پانی پلاسٹک کی بوتلوں میں بھی ملتا ہے جس کا نام " آب علی " ہے۔ یہاں پانی کا ذائقہ انتہائی یاد رکھنے والا ہے اور اس کا اثر کبھی نہ بھولنے والا۔ اس بات کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ ایران میں قیام کے دوران میں جاگنے کی حالت میں ہر دو گھنٹے بعد کچھ نہ کچھ ضرور کھاتا تھا۔ ایرانی کھانے میں اُبلے ہوئے چاول خوراک کا مرکزی جزو ہے، اور کوئی ایرانی دسترخوان ایسا نہیں ہے جس میں تُرشی کو نمایاں حیثیت حاصل نہ ہو اور کچھ نہیں تو سرکے میں ڈوبے ہوئے کھیرے کے قتلے ہی بہت ہیں، کھاتے جایئے پانی پیتے جایئے۔ معدے کی کیا مجال کہ اُف بھی کر جائے۔ میٹھے کے معاملے میں بھی ایرانی خاصے خوش دل ہیں۔ چینی چوکور ٹکڑوں CUBES کی شکل میں سرِعام پائی جاتی ہے اور اکثر ایرانی ان ٹکڑوں کو پہلے چائے میں ڈبوتے ہیں اور پھر بسکٹ کی طرح منہ میں رکھ کر چائے کے گھونٹ لیتے ہیں میں نے دو ایک مرتبہ اس ذائقے سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی مگر شاید مشق نہ ہونے کی وجہ سے اس لطف کو حاصل نہ کر سکا۔ کھانا کھا چکے تو ویٹر نے سویٹ ڈش کے بارے میں پوچھا۔ یہاں ایک اور حیرت کا سامنا تھا۔ ڈش میں چھلکے سمیت کٹا ہوا ربوز اور گرما بھی پیش کیا جا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے ہاں صرف نہار منہ اور شام چار بجے ایک خاص مقدار میں تربوز کھانے کی اجازت ہے۔ بصورتِ دیگر ہیضہ اور دیگر متعدی امراض ارد گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں اور یہاں بلا خوف و خطر پیٹ بھر کر کھانا کھانے، اسلامی بیئر اور پانی کا ½ لٹر پینے کے بعد تربوز کھایا جا رہا ہے۔ تربوز ایرانیوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔ اب مجھے یاد آیا کہ مرکزِ شہر میں کئی ایک مقامات پر میں نے تربوز اور گرمے کے ڈھیر دیکھے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ہوٹل کی کشادہ لابی میں قائم شاپنگ سنٹر دیکھنے کو جی چاہا۔ واسکٹ نوٹوں سے بھری تھی مگر طے یہ ہوا کہ پہلے ونڈو شاپنگ کی جائے کیونکہ ہمارے ہاں کی

طرح یہاں بھی ہوٹل کی دُکانوں پر اشیاء کی قیمتیں مارکیٹ کے نرخوں سے زیادہ ہوں گی۔ بات درست نکلی۔ ایک مناسب سائز کا فیروزہ ۴۸۰۰ تومان ۴۸۰۰۰ ریال کا تھا۔ ٹوتھ پیسٹ میں لانا بھول گیا تھا۔ صبح بھی ڈاکٹر حسنات سے چند گرام اُدھار ٹوتھ پیسٹ مانگ کر اچھا ہمسایہ ہونے کا ثبوت دے چکا تھا چنانچہ کلوزاپ کی چھوٹی ٹوتھ پیسٹ خریدی تو ۱۴۰۰ ریال یعنی ۱۴۰ تومان کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ یہ سب قیمتیں دیکھ کر طے کیا کہ بچوں اور دوستوں کے لیے بھی اگر تحائف خریدنے کا جذبہ شدت اختیار کر گیا تو بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ پاؤں پھیلائیں گے۔ البتہ شیخ اُمید علی صاحب کے لیے یاقوت کا ایک دانہ ضرور لینا ہے چاہے اُس کے لیے لکھ پتی سے ککھ پتی ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ میں زندگی میں پکے وعدے کرنے کا قائل نہیں ہوں مگر جہاں وعدہ کر لیا اُسے پُورا کرنا فرض ہو جاتا ہے (یعنی اس بے وقوفی کی سزا کئی بار بھگتی ہے مگر یہ عادت ابھی تک ترک نہیں کر پایا) کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب آرام کرنے کے لیے چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد شاہ جی، فریدہ اور فرح بھی لفٹ کے دروازے پر کھڑے چابیاں گھُما رہے تھے۔ میں دوپہر میں سونے کا عادی نہیں ہوں۔ دوپہر تو خیر دوپہر ہے۔ رات کو بھی آخری پہر میں کہیں اس نعمت سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملتا ہے۔ مَیں دوبارہ لابی میں آن بیٹھا۔ ایک کونے میں کرنل غفار مہدی اور آغا مرتضیٰ پویا گپ شپ میں مشغول تھے۔ اُن کے ساتھ والی نشست سنبھالی، کرنل صاحب کی پدرانہ شفقت میں کبھی نہیں بھُلا سکتا۔ پُورے دن کی واردات یوں پوچھ رہے تھے جیسے کوئی بزرگ اپنے بچے سے استفسارات کرتا ہے اور اس کی اچھی کارگزاری پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ کافی آچکی تھی اور اب ترلبوز کے بعد کافی کے گھونٹ عجیب قسم کا مزہ دے رہے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ آغا مرتضیٰ پویا ایک دم اپنی نشست سے کھڑے ہوئے اور دُور سے آتے ہوئے ایک بھاری بھرکم شخص کی طرف اشارہ کر کے بولے:

"اوئے تُو ابھی تک زندہ ہے" بُش سوٹ میں ملبوس ایک باوقار شخص قدرے چلتا اور زیادہ لڑھکتا ہوا ہمارے قریب آیا اور آغا صاحب سے بغل گیر ہو گیا۔ یہ ہندوستان ٹائمز کے

راجندر سرین تھے جو بھارت سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ یہ منظر خاصا پُرلطف تھا۔ راجندر صاحب نے تعارف پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی انہوں نے علامہ عارف حسین الحسینی کے بارے میں سوال داغ دیا۔ کچھ باتیں پاکستان کے کردار پر بھی ہوئیں۔ صدر ضیاءُ الحق (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) کے ۲۹ مئی کے حکمنامے، پاکستان کے معروضی حالات، سیاست اور سیاستدانوں پر گفتگو کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا۔ راجندر سرین انتخابات پر کلیتاً متفق تھے کہ مشرقی پنجاب کی صورتِ حال اور راجیو حکومت کی اس ایشو پر پاکستان کے بارے میں پالیسی کے باوجود صدر ضیاءُ الحق نے دوستی کو آگے بڑھانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اِس گفتگو میں کچھ تذکرہ کرکٹ ڈپلومیسی کا بھی ہوا۔ راجندر سرین کا خیال تھا کہ حوالہ کچھ بھی ہو۔ بھارت اور پاکستان تصادم کی پالیسی کو اپنا کر خوش نہیں رہ سکتے اور وہ دَور اب گزر چکا ہے۔ جب دونوں ملکوں کی حکومت ایسی پالیسی کو اپنی کرسیاں مضبُوط بنانے کے لیے اس کو نعرے کے طور پر اپنایا کرتی تھیں۔

کانفرنس کا ذکر چلا تو سب کا خیال یہی تھا کہ آئندہ چند روز میں عراق ایران جنگ کسی خاص موڑ پر پہنچنے والی ہے۔ میری رائے یہ تھی کہ اس عالمی فورم سے عراق اور اس کے اتحادیوں کی مذمت کروائی جائے گی اور ایک متفقہ قرارداد ایسی منظور ہوگی جو عالمی رائے عامہ کو ایران کے حق میں ہموار کرنے میں معاون ثابت ہو سکے۔ اس گفتگو کے دوران ایک اہم "راز" بھی افشا ہوا کہ کانفرنس کے مندوبین میں امریکی بھی شامل ہیں اور شاید ہوٹل پہنچ بھی چکے ہیں۔ یہ خبر بہرحال میرے اور کرنل صاحب کے لیے خاصی حیرت ناک تھی۔ ہم نے اس موضوع کو آئندہ بحث کے لیے رکھ چھوڑا مگر یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ راجندر سرین انگریزی، اُردو اور پنجابی میں ملی جُلی گفتگو کر رہے تھے میرے ساتھ مخاطب ہوتے تو ٹھیٹھ لاہوری کہہ لیں یا امرتسری لہجہ اختیار کرتے۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ لاہور ہم سے زیادہ دیکھا ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ اچھے مرغ چنے کہاں ملتے ہیں، سری پائے بہترین کہاں کے ہیں اور لسّی پینی ہو تو کس کوچے کا رُخ کرنا چاہیئے: کانفرنس کے پروگرام کا ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ سعودی عرب اور اسرائیل کے علاوہ دنیا کے

تقریباً ہر ملک سے سکالر، دانشور اور صحافی کانفرنس میں شرکت کے لیے آ رہے ہیں۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت ایران کے صدر جناب علی خامنائی کریں گے۔ لابی میں کانفرنس کے منتظمین مختلف قسم کے کاؤنٹر لگا رہے تھے، ارنا کا حسن برزوائی حسبِ عادت سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا ہوا اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس شریف آدمی سے جب بھی ملاقات ہوتی تو خیر خیریت ضرور دریافت کرتا۔ پروگرام ابھی چھپ کر نہیں آیا تھا تاہم تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ۱/۲ ۴ بجے کا عمل ہونے کو تھا۔ باتوں میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ بہر حال تینوں بزرگوں کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا جو میرے لیے کسی طرح بھی اعزاز سے کم نہیں تھا۔

ایک فوجی حکمتِ عملی کا ماہر، دوسرا متوازن سوچ رکھنے والا پاکستان کے ایک بڑے انگریزی روزنامے کا مالک و مختار اور تیسرا ایک ایسا عامل صحافی جس نے اپنی زندگی کے کم و بیش ۴۰ برس اس دشت کی سیاحی میں گزارے تھے۔ کانفرنس کے منتظمین کی جانب سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی کہ آج کی شام اور کل کا دن کہاں اور کیسے گزارنا ہے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ وقت بھی ہے اور موقع بھی، کیوں نہ تن تنہا تہران کی سیر کی جائے۔ لوگوں سے باتیں ہوں کچھ حالات کا پتہ چلے۔ بزرگوں سے اجازت طلب کی، تیار ہو کر کیمرہ گلے میں ڈالا اور تہران کی سیاحت کو چل نکلا۔ ایران پہنچنے سے پہلے ذہن میں یہ کھٹکا بھی تھا کہ ہمیں آزادانہ گھومنے پھرنے نہیں دیا جائے گا۔ شاید ہمارے ساتھ ایک آدھ خفیہ پولیس کا آدمی ہو مگر صبح ہی اس خیال کی نفی ہو چکی تھی اور ہم شہر میں اچھی خاصی آوارہ گردی کر چکے تھے۔ یہی بات حوصلہ بڑھانے کے لیے کافی تھی۔ ہوٹل سے نکلا تو آسمان جزوی طور پر ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ سیر کرنے کے لیے اس سے اچھا موسم اور کونسا ہو سکتا ہے، فطرت کی اس مہربانی کا شکر ادا کرتے ہوئے ہوٹل کے سامنے والے چوک میں آ کھڑا ہوا۔ سڑک کے بائیں کنارے کھڑے ہوئے چار منٹ کا عرصہ گزرا تو معاً اپنی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ یہاں تو ٹریفک دائیں ہاتھ چلتی ہے۔ بائیں ہاتھ تو ابھی تک ہم لوگ ہی چل رہے ہیں ورنہ دنیا میں اب خال خال ملکوں میں ہی KEEP TO YOUR LEFT کے بورڈ

دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کاش ہم حاکموں کی دیگر یادگاروں کی طرح اس اصول کو بھی اپنی ضرورت کے مطابق تبدیل کر چکے ہوتے۔ اب مسئلہ سڑک پار کرنے کا تھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ تہران میں ٹریفک گولی کی طرح چلتی ہے۔ سڑک پار کرنے میں کامیاب ہوا تو سامنے ایک صاف ستھری بس کھڑی تھی۔ صاف ستھری سے میری مراد آپ سمجھ گئے ہوں گے یعنی نہ تو اس بس کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے نہ ہی سائلنسر کثیف دھواں چھوڑ رہا تھا اور نہ ہی اس پر بال صفا کریم کا اشتہار تھا۔ بس مسافروں سے تقریباً بھری ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی قطار میں ایک نشست خالی ملی، ایک نوجوان شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھتے ہی سلام داغ دیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ بھائی کسی غلط فہمی میں نہ رہنا میں بھی مسلمان ہوں۔ " ہندی ؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا " No , No پاکستانی " اس موقع پر اپنی گریجوایشن والی اختیاری فارسی بھی کام نہ آئی یا شاید لاشعوری طور پر اس بات کا اعلان مقصود تھا کہ میں ایک پڑھا لکھا مسلمان ہوں، لعد میں جب میں نے اِس صُورتِ حال کا تجزیہ کیا تو یہ ثابت ہوا کہ مجھے اس کے ہندی کہنے پر یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے سر پر بھاری پتھر مار دیا ہو ۔ اس سے پہلے یہ بھی ثابت ہوا کہ میں ایک سچّا اور پکّا پاکستانی ہوں ورنہ "ہندی" کے بجائے وہ مجھے " سری لنکن " بھی کہہ دیتا تو مجھے کیا تکلیف تھی۔ میرے اس زوردار جواب پر وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اپنی تمام تر فارسی جمع کر کے اس کا نام پوچھا :

" مائی نیم ، آغا محمّد رضا " اب اپنی قابلیّت جتانے کی اس کی باری تھی۔ وہ ہر بات مسکرا کر کر رہا تھا۔ چنانچہ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہ لگی کہ ایرانی مسکرا کر پیش آنا عین ثواب سمجھتے ہیں اور یہ اُن کے ملّی مزاج کا حصّہ ہے۔ بس میں سوار ہونے سے پہلے میرے ذہن میں ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ خدا کے فضل سے ایک عرصہ ہوا بس میں سوار ہونے کا سلیقہ بھُول چکا ہے یعنی دھکا دینے کی مشق نہیں رہی ، چلتی ہوئی بس کا ڈنڈا پکڑ کر لٹکنے کی پریکٹس بھُول چکا ہوں اور چار پانچ شرفا کے پاؤں کُچل کر آگے بڑھنے کا ذوق بھی فراموش کر چکا ہوں لہذا بس پر سوار کیسے ہوں گا مگر بس سٹاپ پر مجھے خواتین اور حضرات کی ایک قطار دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی اور اس بات

پر فخر محسوس ہوا کہ چلیئے یہ اسلامی انقلاب لے آئے جو ہم گزشتہ ۴۰ برس سے لانے کے درپے ہیں ان کی عمارات خوبصورت ہیں۔ ان کی سڑکیں کشادہ اور فضا گرد و غبار سے پاک ہے، یہ گفتگو مسکرا کر اور سلیقے سے کرتے ہیں مگر بس میں چڑھنے کے معاملے میں تو ہم سے مار کھا ہی گئے۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہوا کہ بس آئے اور سٹاپ پر قطار میں کھڑے ہوئے مسافر پہلے اُترنے والوں کا انتظار کریں اور پھر اطمینان اور اپنی باری کے ساتھ بس میں اتنے ہی لوگ سوار ہوں جتنی بس میں نشستیں خالی ہیں

بس اگلے سٹاپ پر رُک چکی تھی مگر ابھی تک کسی نے ٹکٹ کا نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی مجھے بس میں کوئی کنڈکٹر نما چیز دکھائی دی تھی۔ آغا محمد رضا نے شاید میری پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ "ٹکٹ دس ریال نہیں ایک تومان" اور پھر آغا نے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ نما پرچی نکال کر ڈرائیور کو تھما دی۔ میرے استفسار پر آغا نے بتایا کہ ہماری بسیں "مادر پدر آزاد" نہیں ہیں کہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے کنڈکٹر یا چیکر قسم کی مصیبتیں پالی جائیں۔ بسوں میں باقاعدگی سے سفر کرنے والے ڈپوؤں سے اکٹھی ٹکٹیں خرید کر اپنی جیبوں میں رکھتے ہیں اور ہر سفر سے پہلے ایک ٹکٹ ڈرائیور کے ساتھ لگے ڈبے میں ڈال دیتے ہیں اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہمارے ہاں کوئی بھی بغیر ٹکٹ سفر نہیں کرتا۔ ایک تومان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ تقریباً ۲۵ منٹ کے سفر کے دوران آغا محمد رضا سے جو گفتگو ہوئی۔ اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے :

آغا صاحب کسی پرائیویٹ کمپنی میں کلرک ہیں۔ ان کی ماہانہ تنخواہ ۷۰ ہزار ریال یعنی ۷ ہزار تومان ہے۔ خود کو غریب سمجھتے ہیں اور ان کے بقول ۷ ہزار تومان میں گزارا مشکل سے ہوتا ہے جنگ کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ یہ ایک ایسا عفریت ہے جس نے پریشان کر رکھا ہے اور یہ بھی کوئی اندازہ نہیں کہ یہ کب بند ہوگی۔ جنگ کوئی اچھی چیز نہیں نہ جانے کب کوئی میزائل عذاب کی طرح نازل ہو جائے۔ یہ تلوار، تیر اور برچھی کی جنگ تو ہے نہیں کہ جس کے بازوؤں میں طاقت زیادہ ہوئی اس نے مدمقابل کا سر کاٹ ڈالا یا سینہ چھلنی کر دیا۔ آغا کا خیال تھا کہ اب جنگ کو بند ہونا چاہیئے۔ بہت طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے موازنہ کیا تو

پتہ چلا کہ ہمارے ہاں بھی ایک ایسی کلاس ہے جو ہر قسم کے حالات میں تقدیر اور صاحبانِ اقتدار سے ایک ہی طرح کا شکوہ کرتی ہے۔ کیونکہ آغا صاحب کے خیال میں شاہ کے زمانے میں بھی حالات ایسے ہی تھے یعنی کہ وہ کلرک ہی تھے" آپ کے خیال میں شاہ کا دور اچھا تھا یا اب آپ چین کی نیند سو رہے ہیں"۔ میں نے سوال کیا۔ " شاہ کے زمانے میں ماحول خاصا کھلا تھا" آغا صاحب بولے: " یعنی شراب، کلب، لڑکیاں، عیاشی ہلا گلا " میں نے لقمہ دیا۔ " اب تو سب ختم ہو گیا ہے۔ پہلے عورتیں سکرٹ پہنتی تھیں اور دل پشوری کے لیے مل بھی جاتی تھیں"۔ وہ گویا میری معلومات میں اضافہ کر رہے تھے " جی میں جانتا ہوں، یورپ ثانی تھا ایران" میں نے اپنی فاضلانہ رائے دی۔ " مگر اب تو ہم اس زندگی کے عادی ہو گئے ہیں دس برس گزر چکے ہیں۔ اچھا جناب میرا سٹاپ آنے والا" وہ سامنے دیکھتے ہی بولے۔ اس وقت بس غالباً جورڈن سٹریٹ میں سے گزر رہی تھی۔ " بھائی مجھے یہ تو بتاتے جاؤ کہ یہ بس جائے گی کہاں"۔ میں نے پوچھا:

" اس کا آخری سٹاپ میدان خمینی ہے آگے آپ جہاں جانا چاہیں"

میں نے آغا محمد رضا کے جذبے سے متاثر ہو کر انہیں اپنے ہوٹل کا پتہ بھی دیا اور کسی روز شام کے کھانے کی دعوت بھی داغ دی جو انہوں نے مسکراتے ہوئے قبول کر لی اور ہاتھ ملاتے ہوئے بس سے نیچے اُتر گئے۔ شام ہونے کو تھی۔ بس مختلف علاقوں سے گزرتی ہوئی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ پورا راستہ خوبصورت مارکیٹیں، پُر رونق بازار اور جگمگاتے اشتہاری سائن بورڈ میرا استقبال کرتے رہے اور میں اِس ساری گہما گہمی میں یہ ڈھونڈ رہا تھا کہ کہیں تو یہ پتہ چلے کہ یہ قوم جنگ لڑ رہی ہے۔ اگلے سٹاپ سے خاتون اسی روائتی لباس میں بس پر سوار ہوئیں۔ پاؤں میں جوگرز، جینز کی پتلون، بدن پر سیاہ رنگ کا اوور آل اور سر بھی سیاہ سکارف سے ڈھکا ہوا۔ پہلی مرتبہ آنکھ بھر کر کسی ایرانی خاتون کا جائزہ لینے کے باوجود چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ جسم کا کوئی حصّہ ستر سے خالی دکھائی نہ دیا۔ خاتون غالباً طالبہ تھیں۔ ہاتھوں میں فائل کور اور دو چار کتابیں، اطمینان سے میرے ساتھ

والی نشست پر بیٹھ گئیں۔ اس سے قبل بس میں بیٹھی خواتین اور مردوں کو دیکھ کر میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ سب خواتین اپنے محرموں کے ساتھ سفر کر رہی ہیں اور شاید یہ بھی حکومت کی طرف سے پابندی ہے کہ کوئی خاتون بس میں تنہا سفر نہ کرے مگر اگلے ہی سٹاپ پر جب چند خواتین اپنی نشستوں سے اُٹھ کر بس سے اُتر گئیں اور ان کے ساتھ بیٹھے مرد اکیلے رہ گئے تو مجھے خاصا حوصلہ ہوا، میں ابھی اس بات کا اندازہ ہی لگا رہا تھا کہ میری ہمراہی خاتون طالبہ ہیں یا اُستاد اور اُن سے بات کرنا کسی حد تک "قانونی" ہو سکتا ہے کہ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی اور وہ خاتون جس جاہ و جلال کے ساتھ بس میں سوار ہوئی تھیں اُسی جلال کے ساتھ واپس اُتر گئیں۔ بس کی آخری منزل آ گئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا چوک ہے جسے میدانِ خمینی کہتے ہیں۔ بس سے اُترا تو مغرب کی نماز ہو رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ سعودی عرب میں اذان کے ساتھ ہی دُکانیں بند ہونے لگتی ہیں اور وہاں میرا سابقہ دو ایک بار ڈنڈا بردار بزرگوں سے بھی پڑ چکا تھا جنہیں متوی کہتے ہیں اور وہ بے نمازوں کو ڈنڈے مارتے ہوئے مسجد کی طرف لے جاتے ہیں۔ میں نے سوچا ابھی میدان کی مختلف سمتوں سے امام خمینی کی ڈنڈا بردار فورس نکلے گی اور مجھ سمیت سڑکوں پر چلنے پھرنے والوں کو دھکیلتی ہوئی مسجدوں کی طرف لے جائے گی۔ مَیں یہ منظر دیکھنے کے لیے سڑک کے ایک جانب کھڑا ہو گیا مگر دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بالآخر مایوس ہونا پڑا۔ میدانِ خمینی سے چاروں طرف مختلف سمتوں میں سڑکیں جا رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو قہوہ خانوں اور چھوٹے موٹے سٹورز کے علاوہ دیگر دُکانیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچا تھوڑی بہت شاپنگ کر لی جائے مگر پھر خیال آیا کہ ہوٹل مہر والے پاکستانی دوستوں نے منع کیا تھا۔ اِس خیال کے آتے ہی سوچا کہ شام ان پاکستانی دوستوں کے ساتھ کیوں نہ گزاری جائے۔ یہ خیال خاصا جاندار محسوس ہوا۔ ایک ٹیکسی والے کو رُکنے کا اشارہ کیا اُسے پتہ سمجھایا اور ۶۰ تومان طے کر کے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی میں نے ڈرائیور سے متوی کے بارے میں پوچھا اس کا جواب خاصا مدلل تھا "نماز اللہ اور اس کے بندے کا معاملہ ہے اور اس میں جبر نہیں ہوتا" اس نے جواب دیا اور ہنسنے لگا۔ موصوف دس منٹ سڑکوں پر گھوم پھر کر

جب مسجد سراج الملک کے دروازے پر لائے تو سامنے کی جگہ کچھ جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ ۶۰ تومان ادا کر دیئے۔ ٹیکسی زُوں کر کے بھاگی تو میں ہنستے ہنستے سڑک پر بیٹھ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر بالکل سامنے وہ جگہ تھی جہاں سے میں ٹیکسی پر سوار ہوا تھا۔ "شاباش جوان، بہت خُوب، بہت یاد آؤ گے"۔ ثابت یہ ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور، ٹیکسی ڈرائیور ہی ہوتے ہیں۔ اسی لمحے اپنا پاکستان اور خاص طور پر ہوائی اڈے کے باہر سٹینڈ پر کھڑے یار بادشاہ بہت یاد آئے۔ دل ہی دل میں اُنہیں سلام کرتا ہوا ہوٹل میں پہنچا۔ ہوٹل کے دروازے پر ایک اور دھچکا لگا۔ بتی غائب تھی۔ یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا یہاں بھی لوڈشیڈنگ ہوتی ہے۔ میرے پوچھنے پر ریاض صاحب نے بتایا کہ تقریباً روزانہ اسی وقت ایک گھنٹے کے لیے بتی جاتی ہے۔ وجہ انہیں بھی معلوم نہیں تھی۔ مَیں نے نوٹ کر لیا کہ اس کی وجہ کسی سرکاری افسر سے پوچھوں گا مگر بدقسمتی سے اپنے قیام کے آخری روز تک مجھے یہ بات یاد نہ آئی اور یہ معمّہ ابھی تک حل طلب ہے کہ تہران کے اس علاقے میں روزانہ بتی کیوں جاتی ہے؟

till here
9.9.97

ون ھندوانہ ٹو مسلمانا

ہوٹل کے بالکل سامنے تقریباً سو گز کے فاصلے پر شہر بازی کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں آسمانی جھولے دور ہی سے دکھائی دیتے تھے۔ ہوٹل سے باہر نکل کر دیکھو تو روشنیوں کے ساتھ ساتھ اس میدان میں ہنستے کھیلتے اور چیختے چلّاتے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں چونکہ پہلے روز ہی اس شہر بازی یعنی کھیلوں کے شہر کو دیکھنے کا قصد کر چکا تھا۔ میرا خیال تھا سیّد افضل حیدر، فرح، فریدہ اور ڈاکٹر احسانات احمد کے ہمراہ اس شہر کی سیر بہتر ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کانفرنس کے منتظمین سے کانفرنس کے معاملات پر گفتگو کر رہے اور سیّد صاحب اینڈ کمپنی ایک بار پھر مرکز شہر کی طرف گئی ہے شاید کوئی شاپنگ وغیرہ کا پروگرام رہا ہوگا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر کیمرہ کندھے پر ڈالا اور شہر بازی کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر بازی کے دو بڑے دروازے ہیں۔ ایک دروازے کے دائیں ہاتھ چار پانچ بوتھ بنے تھے جن کے آگے عورتوں، بچوں اور شہر بازی میں دیگر شائقین کی قطاریں لگی تھیں۔ شرح ٹکٹ ۵۰ ریال یعنی ۵ تومان تھی۔ میں بھی ایک قطار میں کھڑا ہو گیا۔ شہر کے صدر دروازے سے لے کر دور تک چاروں جانب پھیلی ہوئی سڑکوں پر گاڑیوں کا ایک ہجوم تھا۔

آج پہلی مرتبہ میں نے ٹریفک پولیس کے دو اہل کار دیکھے ورنہ تہران بھر میں اتنی ٹریفک کے باوجود مجھے ٹریفک کانسٹیبل کہیں بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں اپنی سوچوں میں گم قطار میں کھڑا تھا کہ ایک سلم سمارٹ سا نوجوان میرے پاس آیا اور بولا " ہندی" ایک بار پھر میرے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی۔

میں نے پھر تفصیلی تعارف کروایا۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگا مجھے پتہ ہے ہوٹل آزادی بزرگ میں کانفرنس ہو رہی ہے۔ میرے سینے پر آویزاں کانفرنس کے نشان کو دیکھتے ہوئے اس نے میرا نام دو تین مرتبہ " افضل شہید " دُہرایا۔ جس کی میں نے ہر بار تصحیح کی۔

نوجوان نے بتایا کہ وہ مقامی پولیس کا ایک اہلکار ہے۔ وہ بڑی محبت سے میرے ساتھ گفتگو کر رہا تھا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ مَیں اس کے حسنِ خلق سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں مجھ سے پوچھا کہ یہاں آکر کسی قسم کا مسئلہ تو نہیں ہے، کوئی مشکل تو درپیش نہیں اردگرد کھڑے لوگ ہمیں بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ (اس امر کا مجھے چار چھ روز بعد پتہ چلا جب ایران میں قیام کے دوران میں نے مشہد جاتے ہوئے پہلی مرتبہ شلوار سُوٹ کی بجائے کوٹ پہنا اب مجھے کسی نے ہندی نہیں کہا تھا) میں شلوار سُوٹ اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا اور اس پورے ہجوم میں لباس کے سلسلے میں بالکل منفرد دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ لوگوں کا مجھے حیرت سے دیکھنا فطری اَمر تھا۔ ایرانی بغیر نکٹائی کے کوٹ پتلون پہنتے ہیں اور عورتوں کے لباس کے بارے میں پہلے ہی تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ البتہ ایک ہی جگہ پر بہت سی عورتوں کو ایک ہی جیسے لباس میں دیکھ کر یک رنگی کا بڑا اچھا تاثر ملتا ہے۔ ٹکٹ خرید کر شہر بازی میں داخل ہوا تو ہمارے ہاں کے فن فیئر کی طرح مختلف قسم کے سٹالز لگے تھے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب پھولوں کا خوبصورت سٹال تھا جس میں رنگ برنگے اصلی اور مصنوعی پھول اور پودے خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ ایرانیوں کو پھولوں سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ آپ کو تقریباً ہر مارکیٹ میں تین یا چار دُکانیں ایسی ضرور ملیں گی جہاں صرف پھول اور پودے فروخت ہوتے ہیں۔ یہاں پھول کو سب سے بہتر اور خوبصورت تحفہ خیال کیا جاتا ہے اور تحفے تحائف کے معاملے میں پھول ہی سب سے اہم جنس ہے۔ ڈاجم کاریں، مختلف قسم کے جھولے اور نشانہ بازی کے سٹال ہی شہر بازی کا حصہ ہے۔ ایک سٹال پر میں نے سٹین گن دیکھی تو میرا بھی جی چاہا کہ قسمت آزمالوں۔ میرا خیال تھا کہ درست نشانہ لگانے کے بدلے کوئی انعام ملے گا۔ مگر وہاں ۳ ریال کے بدلے صرف نشانہ لگانے ہی کی اجازت تھی تاہم مجھے ہدف دیکھ کر

بے حد مسرت ہوئی ۔ یہ اسرائیلی پرچم تھا۔ اس کے باوجود کہ میرا شمار بھی ایک پُرسکون اور خوشحال عالمی معاشرے کے قیام کے خواب دیکھنے والوں میں ہے نہ جانے امریکی اور اسرائیلی پرچم دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سی لہر کیوں دوڑ جاتی ہے۔ میں نے فوراً وہ سٹین گن اُٹھائی: ۳۰ ریال ادا کیے اور دھاڑ دھاڑ اپنے ہدف پر گولیوں کی بارش کر دی ، اسرائیلی پرچم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور سٹال والا میری اس "بہادری" پر مجھے تالیوں کی صُورت میں داد دے رہا تھا۔ شہر بازی لوگوں سے بھرا تھا۔ بچوں کے چہروں پر شگفتہ مسکراہٹیں ، خواتین اور حضرات بچّوں کی فرمائشیں پوری کرتے ہوئے ، کہیں برگر بک رہے تھے ، کہیں چائے ، آئس کریم اور کولڈ ڈرنکس کے سٹال تھے۔ جگہ جگہ پاپ کارن بھی کھل رہے تھے۔ آسمانی جھُولے پر بیٹھے بچوں نے ایک شور برپا کر رکھا تھا اور جھُولے کی رفتار کے ساتھ اس شور میں کمی بیشی ہو رہی تھی۔ شہر کے مشرق والی چار دیواری کے قریب ایک بڑا سا نشان روشن تھا ، یہ ایرانی پرچم پر اللہ کا نشان تھا جو آج کل ایران کا قومی نشان بھی ہے۔ اس شہر میں گھومتے ہوئے عینی اور حسن بہت یاد آئے ۔ یہ جگہ ان ہمارے لاہور کے جوائے لینڈ سے کم سے کم سو گنا بڑی تھی۔ میں نے ایک جگہ سے گرما گرم بھُٹہ خریدا اور اُسے چباتے ہوئے روشنیوں کے اس شہر کی سیر میں مصروف رہا۔ یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ میں جدھر سے بھی گزرتا لوگ میری طرف ضرور دیکھتے اور کبھی کبھار وہی آواز یعنی "ہندی" بھی کانوں میں ضرور پڑتی ۔ ایک جگہ دیکھا تو "کرۂ دہشت" کے نمایاں الفاظ دکھائی دیئے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ یقیناً کوئی خوفناک کھیل ہو گا۔ اس سٹال کی جانب بڑھا مگر وہاں جا کر خاص مایوسی ہوئی ۔ یہ "موت کا گولا" تھا جو ہمارے میلوں میں اکثر لگایا جاتا ہے۔ لوہے کا ایک بڑا سا گولا جس میں موٹر سائیکل سوار مختلف کرتب دکھاتا ہے۔ شہر میں گھومتے گھومتے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ تھکاوٹ کا احساس ہوتے ہی واپسی کا ارادہ کیا۔ دوسرے صدر دروازے سے باہر نکلا تو بگنگ پر ابھی اسی طرح رش تھا۔ واپسی پر پھر اسی نوجوان سے ملاقات ہوئی میں نے اس استفسار پر بتایا کہ شہر بازی ایک خوبصورت جگہ ہے اور مجھے یہ جگہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا کہ میں پولیس میں ہوں۔ اگر آپ کو ہوٹل میں کوئی

تکلیف محسوس ہو تو یہ کارڈ وہاں ڈیوٹی پر موجود کسی بھی پولیس والے کو دیجیے گا وہ آپ کی مدد کرے گا۔

مجھے یہ بات بے حد اچھی لگی تاہم اس کارڈ کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آسکی کیونکہ ہماری نقل و حرکت پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی اور ہمیں اپنے قیام کے دوران کسی جیب کترے سے بھی سابقہ نہیں پڑا۔ بھائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس ہوٹل میں آیا۔ یہاں بھارت سے آئے ہوئے جناب عبدالکریم سے ملاقات ہوئی۔ بھوک آہستہ آہستہ سر اُٹھانے لگی تھی۔ ان کے ساتھ ہی ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے اس اثنا میں سیّد افضل حیدر، ڈاکٹر فاروق اور کرنل صاحب بھی آ گئے۔ ہمارے سامنے والی میز پر ایک سفید بالوں والے خاصے بارُعب شخصیّت کے مالک صاحب تشریف فرما تھے۔ اُن کے ساتھ ہی موٹی موٹی آنکھوں والے ایک اور صاحب کھانے کے انتظار میں تھے۔ دیکھنے میں دونوں پاکستانی لگ رہے تھے۔ میرا تعارف کے لیے بے چین ہونا لازم تھا۔ کرنل صاحب نے آتے ہی اُن دونوں سے ہاتھ ملایا اور ہمارا تعارف ہوا۔ یہ ڈاکٹر زیڈ ایچ زیدی اور پروفیسر گلزار تھے۔ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی آف لندن میں سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں پڑھاتے ہیں۔ جبکہ پروفیسر صاحب کینیڈا کی کارلٹن یونیورسٹی کے سکول آف آرکیٹکچر میں اُستاد ہیں۔

زیدی صاحب انتہائی کمانڈ کے ساتھ فارسی بولتے ہیں اور اُن سے باتیں کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اگر دن بھر کی تھکن کے بعد ایک آدھ گھنٹہ ان کی صحبت میں گزارا جائے تو ان کی دلچسپ مگر پُر مغز گفتگو تھکان اُتارنے اور سوچوں کو کھاد مہیا کرنے کے لیے کافی ہے۔ امریکہ کو عالمی امن اور خاص طور پر مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی جذبات پروفیسر گلزار حیدر کے بھی تھے۔ ان کا تعلق گجرات سے ہے مگر برسوں سے کینیڈا میں مقیم ہیں اور ان کا شمار فنِ تعمیر کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ زیدی صاحب نے نام جانتے ہی کہا ہاں بھئی جنگ لندن میں آپ کے مضامین پڑھتے ہیں۔ آپ تو خاصے ینگ ہیں اور یہی وہ موقع ہوتا ہے۔ جب میں اپنے قد کی وجہ سے عمر چوری میں کامیاب ہو جاتا ہوں چنانچہ میں نے اُنہیں قطعاً یہ نہیں بتایا کہ اِس سال ۱۶ اکتوبر کو ۴۷ برس کا ہو جاؤں گا۔ زیدی صاحب اور گلزار صاحب کا موضوعِ گفتگو کانفرنس میں

امریکی مندوبین کی شرکت تھا۔ ان کی باتوں سے کنفرم ہو گیا کہ امریکی بھی مدعو ہیں اور کچھ امریکی آ بھی گئے ہیں۔ کھانے کے دوران یہ بحث چلتی رہی کہ کانفرنس کے منتظمین کا یہ اقدام کس حد تک جائز ہے کہ انھوں نے اپنے سب سے بڑے دشمن کو بھی مدعو کر لیا ہے۔ بعض لوگ اسے منتظمین کی سیاسی مجبوری قرار دے رہے تھے جبکہ میری رائے میں یہ فراخدلی کی ایک مثال تھی مگر زیدی صاحب اس مفروضے کو ماننے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ ان تمام صاحبان کی مشترکہ رائے تھی کہ یہ اچھا اقدام نہیں ہے۔ ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ راجندر سرین بھی آ گئے اور اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ گفتگو کس حد تک گرما گرم رہی ہو گی۔ سیّد افضل حیدر کا خیال تھا کہ ہمیں مشترکہ طور پر منتظمین سے امریکیوں کو مدعو کرنے پر احتجاج کرنا چاہیئے مگر سرین صاحب کے خیال میں یہ بات درست نہ تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ منتظمین کا اپنا آؤٹ لُک ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اِس فورم سے امریکیوں کو اُن کی بے ہودگیوں کا احساس دلانا چاہتے ہوں۔ کھانے کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی چل رہی تھی۔ گفتگو کا رُخ امریکیوں سے شیعوں کے مستقبل کی طرف مُڑ گیا۔ میرا خیال تھا کہ انقلاب ایران کے بعد شیعہ محض ایک فرقے یا دینی گروہ کے بجائے ایک سیاسی قوت بن گئے ہیں جو بین الاقوامی حکمتِ عملی تیار کرتے وقت بڑی طاقتوں کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ زیدی صاحب اس بات سے متفق تو تھے مگر اُن کا خیال یہ تھا کہ پاکستان میں شیعوں کو اب بہت احتیاط کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا ہو گی۔ اُن کے اِس خیال سے سب نے اتفاق کیا کہ شیعہ علما پر خاص طور پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اختلافی مسائل کو اُچھالنے سے گریز کریں اور ایسے موضوعات کو نہ چھیڑیں جن سے نفرت میں اضافہ ہو۔ اُنہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ شیعہ علما خاصے پڑھے لکھے اور باشعور ہیں اور حالات کے پیشِ نظر وہ اپنے معتقدین کی سوچ تبدیل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ فریدہ اور فرح مینو کارڈ ہاتھ میں لیے کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ انہیں "ہندوانہ" کے لفظ نے پریشان کر رکھا ہے۔ زیدی صاحب نے بتایا کہ بیٹے ہندوانہ فارسی میں تربوز کو کہتے ہیں۔ ویٹر باری باری سب سے

سویٹ ڈش کے بارے میں پُوچھ رہا تھا۔ "سُنا ہے یہاں تربوز بڑا لذیذ ہوتا ہے" راجندر سرین بولے: "جی ہاں! مگر شاید آپ لوگ ایفورڈ نہ کرسکیں۔ کھانے کے بعد ایسی سویٹ ڈش" زیدی صاحب نے کہا: " ایسی بھی کیا بات ہے مَیں تو ہندوانہ ہی کھاؤں گا" راجندر سرین نے کہا ہم سب کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے ویٹر سے کہا " وَن ہندوانہ پلیز " اس کے فوراً بعد جب ویٹر میری طرف مخاطب ہوا تو اچانک میرے منہ سے نکلا:

" وَن ہندوانہ ٹُو مسلمانا پلیز " اِس پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میرے اس آرڈر کا سب سے زیادہ لطف راجندر سرین نے لیا تھا۔ بات شاید ویٹر کی سمجھ میں بھی آگئی تھی کیونکہ وہ بھی ہنستے ہوئے آرڈر لینے چلا گیا تھا۔

لوک ورثہ اور ثقافتِ جدید

یہ حقیقت اگلے روز کُھلی کہ امریکہ سے کتنے مندوبین کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر لابی میں کافی سے شغل کر رہے تھے کہ حسن بُوصراف نے بتایا کہ صبح کانفرنس کے لیے آنے والے مہمانوں کو تہران کی چند تاریخی عمارات کی سیر کرائی جائے گی۔ اس طرح ایک طرف تو غیر ملکی مہمان ایرانی ثقافت اور تاریخی ورثے سے روشناس ہو سکیں گے اور دوسرے اُنہیں ایک دوسرے سے متعارف ہونے کا موقع بھی ملے گا۔ چنانچہ جب ناشتے پانی کے بعد ہوٹل کے گیٹ پر کھڑی بسوں میں سوار ہونے لگے تو معلوم ہوا کہ امریکہ سے تقریباً ۱۲ مندوبین کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں جو اگلے روز اسی ہوٹل کے ایک کشادہ ہال میں منعقد ہونے والی تھی۔ جاپانی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، مصری، بھارتی اور دیگر ملکوں کے سکالر، ماہرینِ تعلیم، دانشور، صحافی اور سیاسی سُوجھ بُوجھ رکھنے والے تقریباً ۲۰۰ خواتین و حضرات کا ایک جتھہ تھا جو بسوں میں سوار ہو رہا تھا۔ ان میں الجزائر کے قومی اخبار کے مدیر اور ان کی اہلیہ بھی تھیں۔ زیدی صاحب امریکیوں کی موجودگی سے انتہائی ناخوش تھے وہ برملا کہہ رہے تھے کہ دشمنوں کے ساتھ بیٹھنا بھی گناہ ہے۔ اُن کا موقف کانفرنس کے آخری اجلاس تک یہی تھا کہ امریکیوں کو بُلا کر اچھا نہیں کیا گیا۔ ایک موقعہ پر تو اُنھوں نے یہاں تک کہا کہ مجھے لگ رہا ہے جیسے ہم فاتحہ کے کھانے پر آئے ہوں بس میں ہم سوار ہوئے اس کے بارے میں بتایا کہ یہ کیبنٹ کی بس ہے اور یہ وزیرِ اعظم اور ان کے وزراء کے خصوصی استعمال میں رہتی ہے اور کیبنٹ کے بعض اہم اجلاس اس

بس بیں ہوتے ہیں۔ ہماری بسوں کے آگے پولیس کی ایک گاڑی تھی جس پر فلیشر لگا ہوا تھا۔اس گاڑی کے آگے دو موٹر سائیکل سوار پائلٹ تھے۔یوں ہمارا قافلہ ایک وی آئی پی جلوس کی صورت میں ہوٹل سے روانہ ہوا۔اس اہتمام کا مقصد بخوبی میری سمجھ میں آرہا تھا۔بسیں ایک بار پھر تہران کی سڑکوں پر رواں تھیں۔پولیس کی گاڑی کا سائرن ٹریفک کو پہلے ہی سے خبردار کر دیتا مگر ایک چوک میں رش کی وجہ سے جب پولیس کی گاڑی بھی رُک گئی تو میں نے دیکھا کہ گاڑی کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھُلا اس میں سے ایک مشین گن بردار نوجوان جو گہرے خاکی رنگ کی وردی میں ملبوس تھا۔ تقریباً چھلانگ لگا کر باہر نکلا اور فائر کرنے کی پوزیشن میں ادھر اُدھر حرکت کرنے لگا۔اُسے دیکھتے ہی ٹریفک کے بادل خُود بخود چھَٹ گئے اور ہم بخوبی ٹریفک کے ایک بیکراں سمندر میں سے گزر گئے۔ ہم ایران کے میوزیم آف کلچرل ہیریٹیج یعنی ثقافتی ورثے کے میوزیم کی طرف جارہے تھے۔راستے میں تین چار چوراہوں پر پولیس کی گاڑی میں سوار نوجوان نے ٹریفک ہٹانے کے لیے وہی عمل دُہرایا۔میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سترہ اٹھارہ سال کا چھریرے بدن کا نوجوان آخر کس فورس سے تعلق رکھتا ہے اور اسے دیکھتے ہی لوگوں کے دل کیوں دہل جاتے ہیں۔معلوم ہوا کہ یہ پاسدار ہے۔پاسدارِ انقلاب ایران کے وارثوں کو کہتے ہیں یعنی وہ کومیٹڈ نوجوان ہیں جو امام خمینی کے سپاہی ہیں اور شاہ کے خلاف جنگ اور اب انقلاب کو برقرار رکھنے اور محاذِ جنگ پر عراقی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے میں بھی یہ فورس پیش پیش ہے۔انہیں ایران میں بڑی عزّت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔یہ وہ انقلابی ہیں جنہوں نے اپنے خون سے انقلابِ ایران کے پودے کو سینچا ہے۔اس موقع پہ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو مَیں نے چند برس پہلے کسی جریدے میں پڑھا تھا۔واقعہ غالباً یوں تھا کہ جس زمانے میں امام خمینی ایران میں تھے وہ شاہ کے عروج کا زمانہ تھا مگر اللہ کا یہ فقیر، حق بات کہنے اور شاہ کی ملوکیت کے خلاف بات کرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔اور آہستہ آہستہ عوام کے دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔شاہ نے امام خمینی کی مقبولیت سے خائف ہو کر ایک روز امام خمینی سے کہا کہ آپ مجھ سے ایک ملین تومان لے لیں اور ایران چھوڑ دیں۔امام خمینی نے جواب دیا تم مجھ سے دو ملین تومان لے لو اور ایران چھوڑ دو

اِس پر شاہ ہنس پڑا اور کہنے لگا میں بادشاہ ہوں تم فقیر، دو ملین تومان کہاں سے لاؤ گے۔ اِس پر امام خمینی بولے میں کل صبح ہی عام اعلان کروں گا کہ جو لوگ شاہ کی ملوکیت سے نجات حاصل کرکے محمدؐ و آلِ محمدؐ کے منشور کا نفاذ چاہتے ہیں وہ ایک تومان چندے کے طور پر دیں تو رضا شاہ پہلوی یقین رکھو کہ تم دو ملین تومان کی بات کرتے ہو یہاں دس ملین تومان رقم اکٹھی ہو جائے گی۔ امام کا جواب سُن کر شاہ نے کہا کہ یہ مانا کہ آپ میرے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکا سکتے ہو اور اُن سے کثیر امداد بھی حاصل کر سکتے ہو مگر میرے پاس ٹینک ہیں، فوج ہے، سپاہی ہیں۔ آپ کے پاس سپاہی کہاں ہیں؟ اور امام خمینی کا جواب تاریخ کے صفحات پر لکھا جا چکا ہے۔ امام نے جواب دیا تھا میرے سپاہی ان دنوں اپنی ماؤں کی گودیوں میں دُودھ پی رہے ہیں۔ جریدے کی رپورٹ کے مطابق یہ بات امام خمینی نے آج سے ۲۷/ ۲۸ برس پہلے کہی تھی۔ آج وہی بچے جو اس زمانے میں ماؤں کی گودیوں میں دُودھ پی رہے تھے۔ امام خمینی کے سپاہی یعنی "پاسدار" ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ائیر پورٹ پر بھی اسی قسم کے نوجوان اہم تنصیبات پر پہرہ دے رہے تھے۔ اب اس بات کی وضاحت بھی ہو چلی تھی کہ دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود انقلاب ایران ابھی تک کامیابی سے ہمکنار کیوں ہے؟ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کہ اس انقلاب کے داعی نوجوان ہیں اور اس انقلاب کے محافظ بھی وہی نوجوان ہیں جن کے دلوں میں امام خمینی نے ایمان کی ایسی شمع جلا دی کہ اب زمانے کی کوئی بھی ہوا اس شمع کو گُل نہیں کر سکتی۔ بس میں ہمارے ساتھ سرکاری اہلکار بھی تھے۔ گلزار حسید صاحب سے باز نہ رہا گیا۔ انہوں نے ایک ایرانی اہلکار سے پُوچھ ہی لیا کہ امریکیوں کو اس کانفرنس میں کیوں مدعو کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اس کے جواب سے مطمئن تو نہیں تھے تاہم اس نے اپنے طور پر خاص طور پر خاص وضاحت کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ضروری نہیں کہ ہر ملک میں لوگ حکومت کی پالیسیوں کے حامی ہوں۔ امریکہ میں بھی انسان دوست ہوتے ہیں اور ہم نے بھی چند انسان دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ بس تہران کی مصروف شاہراہوں سے گزر رہی تھی۔ بینک ملی ایران کا قومی بینک ہے۔ ابھی تک بینکوں کی عمارات کے اِرد گرد ریت کی بوریوں کے

ڈھیر لگے تھے۔ ایرانی اہلکار نے بتایا کہ چھ ماہ پیشتر تہران کے مختلف علاقوں میں تقریباً ۱½ ماہ تک عراقی میزائل گرتے رہے جن کی وجہ سے خاصا جانی و مالی نقصان ہوا اور جنگ چونکہ ابھی جاری ہے لہٰذا دشمن کا کیا بھروسہ کہ کب کمینگی پر اُتر آئے۔ ہمارا قافلہ لوک ورثہ آرگنائزیشن کی طویل و عریض عمارت کے سامنے رُک گیا تھا۔ یہ عمارت فنِ تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ تھی۔ ہمیں مختلف راہ داریوں میں سے گزار کر ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا جہاں بڑے بڑے میزوں کے گرد کُرسیاں لگائی گئی تھیں۔ میزوں پر بڑے بڑے ٹرے رکھے تھے، جن میں سیب، خوبانی، انگور، ناشپاتی، بیری اور آڑو سلیقے سے رکھے تھے۔ یہاں آرگنائزیشن کے سربراہ انجنیئر ھجت سے ملاقات کا اہتمام تھا۔ وہ بڑے رواں اور خوبصورت لہجے میں فارسی بول رہے تھے۔ جسے ایک مترجم انگریزی میں ترجمہ کر کے ہم تک پہنچا رہے تھے۔ انجنیئر ھجت نے بتایا کہ یہ آرگنائزیشن اسلامی انقلاب کے بعد وجود میں آئی ہے اور اس کے قیام کا مقصد ایران کی قدیم تاریخ آرکیالوجی اور تاریخی اشیائے کا تحفظ کرنا ہے۔ ایران کے دیگر شہروں میں بھی اس طرح کے میوزیم قائم کیے گئے ہیں جہاں روائتی فنون کے تحفظ کا سرکاری طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ یہاں ایران کے لوک ورثے کو اس کی اصل حالت میں محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ لوک ورثہ لوگوں کی روزمرّہ زندگی کا غمّاز ہے۔ یہاں صرف ایسے فنون کو تحفظ دیا جاتا ہے جو عوام کی زندگی کا حصہ ہیں۔ انجنیئر ھجت نے مندوبین کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ ایرانی اسلامی انقلاب کا ایک مقصد یہاں کے لوک ورثے کی تجدید کرنا بھی تھا جسے شاہ کے دَور میں یورپی تہذیب کے زیرِ اثر فراموش کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جنگ بند ہو جانے کے بعد حالتِ امن میں ہم اپنے کام کی طرف بہتر طریقے سے رجوع کریں گے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اس عمارت کی تعمیر کا ۲۰ فیصد کام انقلاب سے پہلے CENTRE FOR TRADITIONAL ART کے نام سے ہوا تھا اور ۸۰ فیصد عمارت انقلاب کے بعد تعمیر کی گئی ہے۔ یہاں وہ فنون بھی محفوظ کیے گئے جو ختم ہو رہے تھے چنانچہ مغربی اثرات کو ختم کر کے اصل ایرانی ثقافت کو سنبھالا

جارہا ہے۔ خطاطی کے بارے میں ایک سوال میں انہوں نے بتایا کہ روائتی فنون میں خطاطی ابھی تک زندہ ہے اور بڑے کرّ و فر سے آگے بڑھ رہی ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں انجنیئر ھجبت نے بتایا کہ یہ آرگنائزیشن کلیتاً سرکاری خرچ پر چل رہی ہے اور اس میں ہم کسی بھی رضا کار ادارے سے مالی تعاون حاصل نہیں کرتے۔ یہ میوزیم بلاشبہ ایکڑوں میں پھیلا ہوا تھا جس میں مختلف فنون کے لیے الگ الگ شعبے قائم کیے گئے ہیں۔ جہاں نہ صرف ان فنون کے نادر نمونے محفوظ ہیں بلکہ دستکار اپنے کام میں بھی مگن ہیں۔ ہمیں باری باری تقریباً تمام شعبوں میں لے جایا گیا کہیں وُڈ اور میٹل کارونگ کے خوبصورت نمونے تھے تو کہیں ماہر دستکار مٹی کو اپنے ہاتھوں کی حرکت سے پاٹری کے دلکش نمونوں میں ڈھال رہے تھے۔ ایک شعبہ پینٹنگز اور منی ایچرز کا بھی تھا۔ یہاں اصفہان کے معروف منی ایچرز کے نادر نمونے موجود تھے۔ ایک شعبے میں کھڈی پر ریشم بُنا جا رہا تھا اور دوسرے کونے میں ریشم اور سونے کے تاروں کے ملاپ سے خوبصورت سکارف تیار کیے جا رہے تھے۔ پینٹنگز کے شعبے میں واٹر کلر کا کام دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ہر شعبے میں مرد دستکاروں اور فنکاروں کے ساتھ خاتون ہُنر مند بھی آرٹ کے شاہکار تخلیق کرنے میں مصروف تھیں۔ وُڈ کارونگ کے شعبے میں دستکار مختلف رنگوں کی لکڑی کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایسے ایسے مناظر تخلیق کر رہے تھے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ اس شعبے میں ایک بڑی سی تصویر امام حسینؑ کے گھوڑے کی تھی جو شہادتِ امامؑ کے بعد ٹوٹی ہوئی باگوں اور گرتی ہوئی زین کے ساتھ خیام میں واپسی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میٹل کارونگ کے شعبے میں ایک پچاس سالہ دستکار چھوٹی سی ہتھوڑی اور نوکدار اوزار کے ساتھ خوبصورت پھول اور نقش و نگار بنا رہا تھا۔ اس کے سامنے اس کی میز پر دو نوجوانوں کی تصاویر تھیں۔ میں نے اس سے پُوچھا کہ یہ تصاویر کس کی ہیں؟ اس نے بتایا کہ یہ میرے دو بیٹے ہیں جو انقلاب کی راہ میں شہید ہو چکے ہیں اور جب اُس نے یہ بتایا کہ میرے بس یہی دو بیٹے تھے جو میں اللہ کی راہ میں قربان کر چکا ہوں تو میری آنکھوں میں نمی آ گئی اس کا حوصلہ دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس دستکار کا نام رضا نامجو تھا اور وہ اپنے

دو لعل گنوانے کے باوجود اتنا بلند حوصلہ تھا کہ خود بھی محاذِ جنگ پر جاکر جان دینے کو تیار تھا یہی وہ جذبے ہیں جو قوموں کی عظمت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ مہمانوں کی کثیر تعداد کے پیشِ نظر ہمیں چار گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور یہ چاروں گروپ میوزیم کے مختلف حصّوں میں ایران کے ثقافتی وِرثے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میرے گروپ میں راجندر سرین ہی ایک ایسے تھے جن کے ساتھ میں اُردو یا پنجابی میں گفتگو کر سکتا تھا۔ سیّد افضل حیدر اور اُن کی بیٹیاں اس سفر میں ہمارے ساتھ نہیں تھے وہ صبح حضرت معصومہؑ کے روضے کی زیارت کے لیے قم چلے گئے تھے۔ میری دلچسپی کو دیکھ کر راجندر صاحب مجھ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ میں اس میوزیم اور اس عظیم ثقافتی ورثے کو دیکھ کر اتنا جذباتی کیوں ہو رہا ہوں اور پھر مجھے بتانا پڑا کہ کچھ عرصہ میرا تعلق بھی اسلام آباد میں قائم لوک ورثہ کے قومی ادارے سے اس حوالے سے رہ چکا ہے کہ مَیں اِس ادارے کے ساتھ منسلک ایک غیر سرکاری آرگنائزیشن نیشنل کرافٹس کونسل کا ایگزیکٹیو سیکرٹری تھا۔ میں نے تقریباً ۲ برس شکر پڑیاں اسلام آباد میں ہونے والے قومی لوک میلے میں عملی طور پر حصّہ لیا اور پاکستان میں دستکاریوں کے انحطاط اور ان کی وجوہ پر ایک جامع رپورٹ بھی لکھی۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک یہ مسئلہ اربابِ اقتدار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم اپنے عظیم قومی لوک ورثے کو کسی طرح محفوظ کریں اور ماہر دستکاروں کو بھوک کی عفریت سے کس طرح بچائیں۔ بس قرار دادیں ہی قرار دادیں ہیں، رپورٹیں ہی رپورٹیں ہیں، وعدے ہی وعدے ہیں، عمل کچھ بھی نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف ماہر دستکار اپنے روائتی فنون کے ساتھ اس دُنیا سے رخصت ہو رہے ہیں بلکہ وہ اپنے انمول آرٹ کا کوئی وارث بھی چھوڑ کر نہیں جا رہے۔ پھر میں نے اپنے اسلام آباد والے لوک ورثہ میوزیم کا اس میوزیم سے مقابلہ کیا تو شرمندگی سی ہونے لگی۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تصاویر بناؤں ہر شعبے میں دستکاروں سے باتیں کروں اور یوں اپنی رُوح کی پیاس بجھاؤں مگر ظہر کی اذان کے ساتھ ہی واپس ہوٹل چلنے کا اعلان ہو رہا تھا۔ تاہم اس مختصر سے وقت میں جو کچھ بھی دیکھا اور

سمجھا، کافی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک تشنگی کا احساس آج بھی موجود ہے۔ بسیں پھر روانہ ہوئیں۔ مَیں یہ بات خاص طور پر نوٹ کر رہا تھا کہ ہمیں کسی مخصوص راستے سے لایا اور لے جایا نہیں جا رہا تھا۔ بلکہ یہ تہران کے عام بازار اور سڑکیں تھیں جہاں کہیں کہیں فٹ پاتھ پر کچھ بھکاری نما لوگ بھی دیکھنے کو ملتے تھے۔ ہماری اگلی منزل ایران کا کارپٹ میوزیم تھی۔ کارپٹ میوزیم کی عمارت کارگر ایونیو میں واقع ہے۔ یہ عمارت جدید طرزِ تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے یہ عمارت ۱۹۷۸ء میں تعمیر کی گئی تھی اور اس کی تعمیر کا مقصد ایران کی روائتی قالین بافی کے نادر نمونوں کو محفوظ کرنا تھا۔ قالین بافی ایران کے روائتی فنون میں اوّل درجے کا آرٹ ہے یوں تو ایران میں قالین بافی کا اصل ماخذ کسی کو بھی معلوم نہیں تاہم ۲۵۰۰ سال پُرانے پذیرک قالین کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ آرٹ ایران میں پانچویں صدی قبل از مسیح میں موجود تھا۔ (قالین کا یہ نادر نمونہ ۱۹۴۹ء میں سائبریا میں بھی دریافت ہوا تھا) میوزیم کی عمارت بڑے بڑے ہالوں پر مشتمل ہے جس میں ۱۶ ویں سے ۲۰ ویں صدی کے درمیان کے قالینوں کے نمونے تحقیق و جستجو کرنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتے ہیں۔ یہاں قالینوں کے تقریباً دو سو نادر نمونے محفوظ ہیں جن میں کاشان، کرمان، اصفہان، تبریز اور کوردستان کے علاقوں کے قالین بھی شامل ہیں۔ انقلابِ ایران کے بعد اس میوزیم میں چند نادر قالینوں کا اضافہ ہوا ہے یہ قالین رضا شاہ پہلوی کے سعد آباد کے محل سے حاصل کر کے اس میوزیم میں شامل کیے گئے ہیں۔ میوزیم میں قالینوں کے علاوہ ساڑھے تین ہزار کے قریب کتب پر مشتمل ایک لائبریری بھی قائم ہے جس میں فارسی عربی، فرانسیسی، انگریزی اور جرمن زبان کی کتابیں شامل ہیں۔ میوزیم کے آڈیٹوریم میں ہمیں قالین بافی کے مختلف مراحل پر مشتمل ایک دستاویزی فلم بھی دکھائی گئی، جس میں اُون کی تیاری، رنگائی اور قالین بافی کے دیگر مراحل پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔

ایران میں فنِ پہلوانی کو خاصی اہمیت حاصل ہے جس طرح ہمارے ہاں پہلوان مٹی کے اکھاڑوں میں پہلوانی کی گُر سیکھتے ہیں اسی طرح ایران میں بھی اس فن کو سیکھنے کے لیے مخصوص

عمارات بنائی گئی ہیں ا یہاں جسم مٹی میں تو لت پت نہیں ہوتا البتہ زور آزمائی اور کشتی کے دیگر داؤ پیچ کے علاوہ یہاں جسمانی تربیت کی جدید سہولتیں بھی میسّر ہیں۔ ایرانی ان اکھاڑوں کو "زُور خانے" کہتے ہیں۔ تہران میں قائم زُور خانے کو دیکھنے گئے تو فنِ پہلوانی میں ایرانیوں کے ذوق و شوق کا بخوبی اندازہ ہوا۔ ایران کی قدیم تاریخ کے معاملے سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ۱۲ صدیاں پہلے سیاح ایرانی نوجوانوں کو جنگی حکمتِ عملی سکھاتے تھے، فردوسی نے اپنے شاہنامے میں ہزاروں اشعار ایسے لکھے ہیں جن سے ایرانیوں کے اس فن میں طاق ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک بلند و بالا عمارت تھی جس کی چھت میٹروں کے حساب سے بلند تھی۔ سرکس کے رنگ کی طرح زمین کو کھود کر ایک دائرہ نما اکھاڑا بنایا گیا تھا جس کے چاروں جانب سیڑھیاں تھیں جن پر بیٹھ کر اس کمرہ میں ہونے والے کھیل دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ۲۴ سال کی عمر تک ہر ایرانی کے لیے باکسنگ سیکھنا لازمی ہے۔ یہ زُور خانے بینک مِلّی ایران کے تعاون سے چلتے ہیں جہاں پہلوانوں کو معقول معاوضے دیئے جاتے ہیں۔ زور خانے کے پہلوانوں کے فن کا مظاہرہ شروع ہونے سے پہلے انگریزی میں زور خانے کی تاریخ اور قومی کردار اور صحت مند نوجوان نسل کی تشکیل میں اس کے کردار پر روشنی ڈالی گئی۔ ایک کونے میں ایک چبوترے پر ایک شخص دف نما چیز بجانے لگا اس کے بالکل سامنے ایک گھنٹی لٹک رہی تھی وہ دف بجاتے بجاتے ایک ہاتھ سے گھنٹی بھی بجاتا اور یُوں زور خانے کے ماحول میں موسیقی کا سحر پھیل جاتا۔ پروگرام کے آغاز میں ساٹھ پینسٹھ سال کا ایک پہلوان نمودار ہوا جس کے بارے میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ اُستاد یا خلیفہ نما چیز ہے۔ اُس نے آتے ہی ہمارے پہلوانوں کی طرح زمین کو بوسہ دیا، کانوں کو ہاتھ لگایا اور اس کے ساتھ ہی مختلف عمروں کے پہلوان جن کے جسم گٹھے ہوئے اور مضبوط تھے۔ پھولوں کے گلدستے ہاتھوں میں اُٹھائے ہال میں داخل ہوئے۔ اِن سب نے بھی اپنے اُستاد کی تقلید کی۔ وہ اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں حرکت بھی دے رہے تھے جیسے وارم اپ ہو رہے ہوں۔ اُستاد نے آتے ہی صلوٰۃ کا نعرہ بلند کیا اور تمام پہلوان یک زبان ہو کر درود پڑھنے لگے۔

اِس کے ساتھ ہی چبوترے پر بیٹھے ہوئے پہلوان نے دَف اور گھنٹی کی ملی جُلی دُھن کے ساتھ استقبالیہ گیت گانے شروع کیے۔ اب یہ سارے پہلوان یہ گلدستے مہمانوں کے سامنے ڈالتے جارہے تھے۔ استقبالیہ گیت ختم ہوا تو میوزک ماسٹر نے مہمانوں کی سلامتی، انقلاب کی سلامتی اور امام خمینی کی زندگی اور سلامتی کے لیے دُعا کی اور پھر مشق کا آغاز ہوگیا۔ اکھاڑے کے رنگ کے ساتھ مختلف قسم کے کسرتی آلات رکھے تھے جن میں ڈھالیں اور تلواریں بھی تھیں اور بڑے بڑے ڈمبل بھی تھے۔ پہلوانوں نے یہ ڈمبل گھمانے شروع کیے اور انفرادی اور اجتماعی مشقیں کرنے لگے۔ ہر مشق کے آغاز سے پہلے وہ نعرۂ صلوٰۃ ضرور بلند کرتے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درُود بھیجنے کے بعد مشق کا آغاز کرتے۔ میوزک ماسٹر فردوسی اور حافظ کے اشعار باآواز بلند پڑھ رہا تھا اور دَف اور گھنٹی کو مسلسل مصروف رکھے ہوئے تھا۔ جسمانی ورزش اور موسیقی کا یہ عجیب و غریب سنگم مجھے بے حد بھلا لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے غیرملکی دوست بھی اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان مشقوں میں بعض جنگی پینترے بھی شامل تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ آج کی جنگ اگر میزائل، توپ، گولے اور کیمیائی ہتھیاروں کی جنگ کے بجائے تیر، تلوار اور نیزے کی لڑائی ہوتی تو شاید ایرانی آدھی دُنیا فتح کر چکے ہوتے۔ مشقوں کے دوران ہمیں ٹھنڈے مشروبات اور بسکٹ وغیرہ پیش کیے گئے۔ شیرینی کے معاملے میں ایرانی شاید کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور میں نے ایران میں اپنے قیام کے دوران ایرانیوں کو جس انداز سے میٹھا کھاتے دیکھا ہے اگر کہیں ایران میں چینی کا قحط پڑ جائے تو مجھے اس خبر پر بالکل حیرت نہ ہوگی۔ مشقیں ختم ہوئیں تو ایک بار پھر دعاؤں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میوزک ماسٹر شہدائے کربلا کی ارواح اور عراق ایران جنگ میں شہید ہونے والوں کی ارواح کے ایصالِ ثواب کے لیے دُرود پر دُرود پڑھوا رہا تھا اور پھر اس نے دشمنوں پر لعنتیں بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا اور بدی کی تمام قوتوں کو جہنم واصل کرنے کی دُعا کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اتفاق کی بات ہے کہ مجھے ہر بار اس لِس میں بیٹھنے کا موقع ملا جس میں حضرت علیؑ کی شبیہہ لگی ہوئی تھی۔ ایران میں یہ شبیہہ آپ کو عام ملے گی (میں نے اپنے

قیام کے دوران اس پر بھی تحقیق کی ہے جس کا تذکرہ آپ کو آئندہ کسی باب میں ملے گا) شام کے دُھندلکے پھیل رہے تھے۔ سڑکوں پر ایک بار پھر کاروں کا ہجوم تھا جن میں ۹۷ فیصد پیکان تھی۔ یہ ہمارے ہاں کی سُنی کی طرح کی کار ہے۔ میرے استفسار پر ایرانی اہلکار نے بتایا کہ ایران میں بسیں اور ٹرک بھی بنائے جاتے ہیں۔

جب کہ پُرانے دَور کی BMW فرانسیسی گاڑیاں بھی ایک بڑی تعداد میں ایران میں موجود ہیں تاہم میں نے مرسڈیز اور شیورلیٹ بھی دیکھیں۔ ایرانی کار پیکان کی قیمت تقریباً ۶ لاکھ تومان ہے اس کے پُرزے بھی مقامی طور پر دستیاب ہیں لہذا اس کا مقبول ہونا اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ جبکہ پٹرول صرف ۲ ریال فی لیٹر ہے جو تقریباً مُفت کے برابر ہے۔ راستے میں ایک بورڈ پر نظر پڑی تو دل بے حد خوش ہوا۔ اس پر لکھا تھا " ایم اے جناح روڈ " یعنی ایم اے جناح اپنے بابائے قوم کے نام پر سڑک دیکھ کر خوش ہونا لازمی امر تھا فوراً خیال آیا کہ اگر ہمارے ہاں قذافی کے نام پر سٹیڈیم، جمال عبدالناصر کے نام پر ایک معروف چوک اور شاہ فیصل کے نام پر پاکستان کی سب سے بڑی مسجد ہو سکتی ہے تو ہم کسی سڑک کا نام امام خمینی روڈ کیوں نہیں رکھ سکتے۔

اس طرح سفارتی تعلقات مضبوط ہوتے ہیں، محبّت بڑھتی ہے اور اخوت میں اضافہ ہوتا ہے اور میرے خیال میں راولپنڈی کی معروف شاہراہ پہلوی کا نام اب امام خمینی روڈ رکھ دینا چاہیئے کیونکہ پاکستان میں کسی سڑک کا نام بادشاہ کے نام پر اچھا نہیں لگتا اور یُوں بھی پاکستانی قوم ذہنی اور عملی طور پر ملوکیت کے خلاف ہے۔ بشرطیکہ یہ مارشل لا کی صُورت میں نہ ہو جسے اب تک کئی بار اس خیال سے قبول کیا جا چکا ہے کہ ہر رات کے بعد سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے۔

ہوٹل میں کانفرنس کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ آج سیکورٹی کا بھی زبردست انتظام تھا۔ ہوٹل میں داخلے کے لیے الگ الگ دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ کانفرنس کے مندوبین کے علاوہ ہر آنے والے کی مکمل تلاشی لی جا رہی تھی۔ سیکورٹی گارڈز کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا تھا اور ہمیں بھی تنبیہ کر دی گئی تھی کہ کانفرنس کا نشان ہمہ وقت اپنے سینوں پر سجائے رکھیں۔ میری تو خیر

اپنی ایک پہچان بھی۔ پورے ہوٹل میں، مَیں واحد شخص تھا جس نے شلوار قمیض اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ ایک دو بار ہوٹل سے باہر اور اندر آنے کے بعد اب سکیورٹی گارڈز کو میری پہچان ہوگئی تھی ایرانی اخبارات کیہان انٹرنیشنل، روزنامہ اطلاعات، روزنامہ رسالت اور کینیڈا سے شائع ہونے والے اسلامی تحریک کے اخبار کریسنٹ اور تہران ٹائمز نے کانفرنس کے انعقاد کی خبریں جلی سرخیوں سے شائع کی تھیں اسی روز تہران میں علامہ عارف الحسینی کی شہادت کے سلسلے میں ہونے والی تقریبات کا احوال بھی اخبارات نے اپنے اوّلین صفحات پر شائع کیا تھا۔ انہی خبروں کو ایران کے سپیکر اور قائم مقام کمانڈر انچیف علی اکبر ہاشمی رفسنجانی کا ایک بیان بھی شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے پاکستان کے صدر محمد ضیاالحق سے کہا تھا کہ وہ علامہ کے قاتلوں کو جلد کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ انہوں نے اپنے بیان میں اسے فرقہ واریت کی ایک گھناؤنی سازش قرار دیا تھا۔ رات کے کھانے کی میز پر زیدی صاحب ایک مرتبہ پھر چراغِ محفل بنے بیٹھے تھے موصوف کچھ عرصہ دیال سنگھ کالج میں لیکچرارشپ بھی کر چکے ہیں۔ سیّد عابد علی عابدؔ مرحوم کے ساتھ اپنے پہلے انٹرویو کا قصّہ سنا رہے تھے۔ اس ڈنر میں ہمارے ساتھ تیونس کا ایک سکالر پروفیسر تراب رمزی بھی موجود تھا۔ خبر آچکی تھی کہ ایران نے اصولی طور پر سلامتی کونسل کی قرارداد ۵۹۸ کو تسلیم کر لیا ہے مگر جنگ بندی کی حتمی تاریخ کا اعلان اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کریں گے۔ یہ خبر خاص طور پر کانفرنس کے مندوبین کے لیے انتہائی اہم تھی۔ جیسا کہ مَیں پہلے بھی اس رائے کا اظہار کر چکا ہوں کہ یہ کانفرنس عالمی رائے عامہ کو عراق کے خلاف اور ایران کے حق میں بیدار کرنے کے لیے بلائی گئی تھی اور اب قرارداد ۵۹۸ کی منظوری کی صورت میں مقصد صرف یہ نہیں رہ گیا تھا کہ عراق اور اس کے اتحادیوں کو بُرا بھلا کہا جائے اور اُن کے جنگی جرائم کو بے نقاب کیا جائے بلکہ اب کانفرنس کے مندوبین کے سامنے خلیج میں مستقبل کی سیاست اور اس طویل جنگ کے بند ہونے کے عالمی امن پر اثرات اور بڑی طاقتوں کی آئندہ کی حکمتِ عملی پر گفتگو کے دروازے کھُل گئے تھے۔ اس موضوع پر بحث چھڑی تو میرا موقف یہی تھا کہ اب یہ

کانفرنس محض مقالے پڑھنے اور اُن پر بحث کرنے پر ہی ختم نہیں ہوگی بلکہ اس نئی صورت حال کے حوالے سے کئی نئی جہتیں پیدا ہوں گی۔ اِس خبر کے بعد دو بڑے سوال سامنے آئے تھے۔

اوّل: کیا ایران نے اپنے دیرینہ موقف کو چھوڑ کر جنگ بندی قبول کی ہے

دوم: کیا یہ سفارتی سطح پر ایران کی فتح ہے۔

اِن دونوں سوالات کو جب کانفرنس کے مختلف مندوبین کے سامنے رکھا گیا تو اس بات پر تو سارے متفق تھے کہ ایران نے جنگ بندی قبول کر کے اُن تمام قوتوں کو حیرت زدہ کر دیا ہے جو ایک عرصہ سے اس جنگ کو بند کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کر رہی تھیں، بعض کا کہنا تھا کہ ایران کا مسافر بردار طیّارہ جو تہران سے دبئی جا رہا تھا سمندر میں گرا کر امریکہ نے ایران کو باور کرایا ہے کہ وہ جنون کی کسی بھی حد کو چھُو سکتے ہیں اور یہ ایک طرح کا دباؤ ہے جسے بالآخر ایرانی حکومت برداشت نہیں کر سکی۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ اتنی طویل جنگ نے فریقین کو تھکا دیا ہے مگر ایران نے پہل کر کے سفارتی سطح پر بھی فتح حاصل کی ہے۔ وار ہیڈ کوارٹر کی اطلاعات کے مطابق اس وقت عراق کے پاس ایران کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ لہذا جنگ کو مزید جاری رکھنا خود ایران کے حق میں نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

اِس معاملے پر دیر تک بحث چلتی رہی۔ اگلے روز کانفرنس کا اختتامی اجلاس تھا۔ اب ہمارے ساتھ تیونس کے پروفیسر تراب رمزی کے علاوہ راجندر سرین اور سری لنکا کے مندوب فیض مصطفےٰ بھی آن ملے تھے، فیض مصطفےٰ سری لنکا کے صدر کے وکیل ہیں اور وہاں پریذیڈنٹس کونسل سے باقاعدہ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس حلف لیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ تقریبِ حلف برداری کے آغاز پر جب چیف جسٹس نے کہا کہ ” ان دی نیم آف پریذیڈنٹ آف سری لنکا “ تو میں نے جواب میں پڑھا ” ان دی نیم آف اللہ “ اس پر پورے کورٹ روم کو سانپ سُونگھ گیا مگر میں نے صدر کے نام کے بجائے اللہ کے نام پر حلف لیا۔ فیض مصطفےٰ خاصے تیز لہجے میں انگریزی بولتے ہیں اور اُردو جاننے کے باوجود زیادہ تر گفتگو انگریزی ہی میں کرتے ہیں۔ مختی سے اس شخص

نے خاصا متاثر کیا۔ ساری دنیا گھوم چکے ہیں اور اپنی صاف گوئی اور اپنے پیشے میں اعلیٰ مقام کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔ پروفیسر تراب سے تعارف ہوا تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ ایک عرصے سے سوئٹزرلینڈ میں مقیم ہیں۔ اُن کا تدریسی موضوع تو ریاضی ہے مگر اب تک اسلام پر متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ تیونس کی حکومت ان کی حق گوئی کی وجہ سے ہمیشہ اُن سے خائف رہتی ہے حکومت نے اُن سے معاملہ کرنے کے لیے اُنہیں ایک بار ایک مل کی بھی پیشکش کی تھی مگر وہ اپنے کام میں مگن ہیں۔ دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ آج جلدی سونے کا پروگرام بن رہا تھا کیونکہ صبح کانفرنس ہونے والی تھی جس میں وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔

ہوٹل قیام کے دوران سید افضل حیدر صاحب کا دم میرے لیے اس حوالے سے غنیمت رہا کہ انہوں نے ایک اچھے بزرگ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ہمیشہ میرا دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے جگایا۔ فیض مصطفےٰ صاحب کو ایک اور پریشانی لاحق تھی اور جب انہوں نے اپنی پریشانی کا اظہار مجھ سے کیا تو تقریباً ویسی ہی پریشانی نے مجھے بھی آن گھیرا۔ مسئلہ اپنی اپنی بیگمات کو فون پر خیریت کی اطلاع دینے کا تھا۔ ہوٹل کا آپریٹر کوئی بھی غیر ملکی کال بُک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس کا کہنا تھا کہ انٹرنیشنل گیٹ وے پر آپریٹر یہ کالیں قبول نہیں کرتا اور پھر مجھے مہمانوں کے سامنے شرمندگی اُٹھانا پڑتی ہے۔ یوں بھی اس کا کہنا تھا کہ کال کم سے کم ۲۴ گھنٹے پہلے بُک کروائی جائے۔ اس قسم کے معاملات پیش آنے کی صُورت میں ڈاکٹر فاروق حسنات مجھے پہلے ہی سمجھا چکے ہیں مگر فیض صاحب مُصر تھے کہ آج بات ضرور کروں گا۔ آپ کو پتہ نہیں ہے مجھے اپنی بیوی سے کتنا پیار ہے اور وہ میرے لیے کس قدر پریشان ہوگی۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر کمرے کی چابی لی اور لفٹ میں سوار ہوگئے۔ لفٹ دیگر غیر ملکی مندوبین سے بھری ہوئی تھی اور اس میں دو تین ایرانی علما بھی موجود تھے۔ میں نے ۲۰ ویں منزل کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ سبک خرامی سے چلنے لگی مگر ۱۸ ویں منزل پر جا کر جب اس نے آگے بڑھنے، نیچے اُترنے یا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا تو لفٹ میں سوار سب کے دل ایک لمحہ کو تو یقینی طور پر دہل گئے لفٹ کو ساکت

حالت میں کھڑے تقریباً ۷ منٹ گزر گئے تھے کہ برطانوی مندوب ڈاکٹر جیمز او کونل نے لفٹ میں سوار علمائے سے درخواست کی کہ وہ خیریت کی دُعا کریں ۔ ابھی ہم لوگ انگریز کی اس بذلہ سنجی پر ہنس ہی رہے تھے کہ لفٹ ایک جھٹکے کے ساتھ پھر اُوپر کو اُٹھی اور بالآخر ہم اپنی اپنی منزلِ مقصود یعنی کمروں تک پہنچ گئے ۔ اگلے روز جب میں نے اس واقعہ کا تذکرہ ڈاکٹر فاروق حسنات سے کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ بھی لفٹ میں پھنس گئے تھے اور یہ ہوٹل کی آخری یعنی ۲۶ ویں منزل تھی ۔ جہاں ایک خوبصورت ریسٹورانٹ بنایا گیا ہے مگر یہ جگہ ایک عرصے سے استعمال نہیں کی جارہی ۔ اس کے بعد تو یہ روز کا معمول ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی دوست لفٹ میں پھنس جانے کا قصہ ضرور سُناتا ایک روز ہم نے اجتماعی طور پر ہوٹل کی انتظامیہ سے اس امر کی شکایت کی کہ مبادا کوئی حادثہ ہی ہو جائے ۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہمارے انجنیئر محاذِ جنگ پر دشمن سے برسرِ پیکار ہیں ۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ کام چل رہا ہے ۔ آپ حوصلہ رکھیں خدا آپ کا حامی و ناصر ہے ۔

اس جواب کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔ کمرے میں پہنچ کر ٹی وی کا سوئچ آن کیا تو عربی میں خبریں نشر کی جارہی تھیں ۔ پشاور میں علامہ عارف الحسینی کے جنازے کی خبر لیڈ نیوز تھی اس جنازے میں صدر ضیاء الحق کو بھی نماز پڑھتے دکھایا گیا ۔ امام خمینی کے خصوصی نمائندے کی تقریر اور لوگوں کو دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے دکھایا گیا اور اس کے بعد ہونے والے حکومت اور امریکہ کے خلاف مظاہرے کو بھی مکمل کوریج دی گئی ۔ ایرانی ٹی وی پر فارسی کے علاوہ عربی اور انگریزی میں بھی پروگرام ہوتے ہیں جن میں رپورٹیں ڈرامے اور علمی و ثقافتی پروگرام بھی شامل ہیں رات کو خبروں کے بعد قرآن کی تفسیر کا پروگرام بھی دکھایا جاتا ہے ۔ عراقی اور امریکی جنگی مظالم پر مبنی دستاویزی فلموں کو خاص طور پر دکھایا جاتا ہے ۔ مسافر بردار طیارہ گرائے جانے پر مذمتی بیانات کی فلم تقریباً ۴ ۔ ۵ روز تک دکھائی جاتی رہی ۔ جس میں آغا مرتضیٰ پویا ، ایئر مارشل ذوالفقار علی خان ، مشاہد حسین اور سید افضل حیدر کے بیانات بھی شامل تھے ۔

وہاں ٹی وی پر مرد حضرات اناؤنسر ہیں مگر ڈراموں میں خواتین باقاعدگی سے اداکاری کرتی ہیں اور بعض نیوز ریڈر بھی خواتین ہیں ۔ ایران میں فلمی صنعت بھی باقاعدگی سے موجود ہے ۔

اَب اس میں وہ دم خم تو نہیں رہا جو مار دھاڑ اور جنس و جرائم کی فلمیں بنا کر پیدا کیا گیا تھا۔ تاہم اب بھی جرائم اور دیگر سماجی موضوعات پر فلمیں بنتی ہیں، سینما گھروں میں لگتی ہیں اور لوگ اُنہیں دیکھنے جاتے ہیں۔ تہران کے ایک سینما میں بھارتی فلم "مشعل" لگی ہوئی تھی۔ اِس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ایران کے ثقافتی مراسم شاید پاکستان سے زیادہ بھارت سے ہیں۔

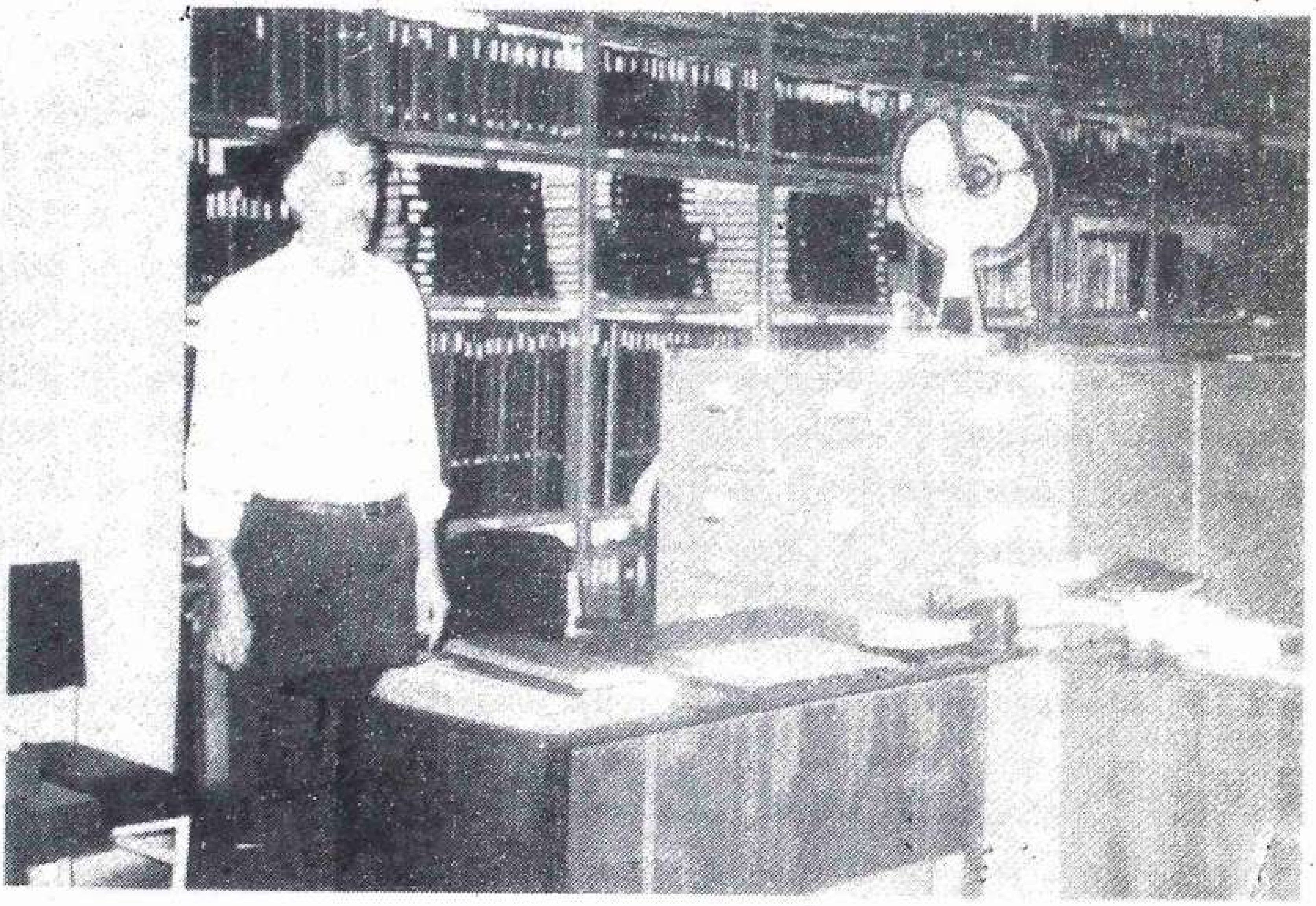

روزنامہ اطلاعات کی ریفرنس لائبریری

عالمی کانفرنس دفاع و تجاوز تہران ۸ تا ۱۰ اگست ۱۹۸۸ء

کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کا وقت ۸ بجے صبح تھا۔ لہذا جلد بیدار ہونا پڑا۔ حسب معمول سید افضل حیدر صاحب نے گہری نیند سے بیدار کیا۔ ہوٹل کی لفٹ کے بارے میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اپنی مرضی سے چل رہی تھی اور کبھی کبھار کسی ایک منزل پر دھوکہ بھی دے جاتی تھی۔ تیار ہو کر کانفرنس کا خصوصی طور پر دیا گیا فولڈر تھاما، سینے پر کانفرنس کا نشان سجایا اور پاکستانی لباس زیب تن کر کے لفٹ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ سید صاحب، فریدہ اور فرح بھی وہاں موجود تھیں۔ مَیں نے شاہ صاحب کے چمکتے ہوئے جوتوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا:
"خصوصی سلوک کیا گیا لگتا ہے" کہنے لگے اپنے جُوتے بھی تو دیکھیں، وہی پالش ہے جو گھر سے ہو کر آئی تھی۔ یہاں جُوتے گندے ہونے کا مقام کہاں اور یہ حقیقت ہے کہ ایران کے قیام کے دوران ایک مرتبہ بھی جوتے پالش کرنے کی حاجت نہ ہوئی (کیوی اور چیری بلاسم بنانے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ) جُوتے گندے ہوتے ہیں۔ گرد و غبار سے اور اس جنس کا کم سے کم ایران کے شہروں میں کہیں کوئی وجود نہیں۔ لفٹ کے دروازے پر کھڑے دس منٹ کا عرصہ گزر گیا تو ہم سب تشویش میں مبتلا ہوئے۔ بار بار بٹن دبانے سے بھی کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ اُدھر سکیورٹی کا یہ عالم تھا کہ ہر فلور پر دو دو سکیورٹی گارڈ بٹھا دیئے گئے تھے جو سینے پر کانفرنس کا نشان سجا دیکھ کر فوراً سلوٹ مارتے۔ لفٹ کے دروازے پر کھڑے جب پندرہ منٹ کا وقت گزر گیا تو اُن میں سے

ایک سکیورٹی گارڈ نے فارسی میں سیڑھیوں کے استعمال کا مشورہ دیا جسے سید صاحب نے سمجھتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ ۲۰ سیڑھیاں اُترنا بھی ایک مسئلہ تھا جب کہ سید صاحب کا بائی پاس اُن کی بوشرٹ کے اُوپر کے دو بٹن کھل جانے سے صاف دکھائی دیتا تھا مگر وہ ہمارے ساتھ بڑی چابکدستی سے سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔ لابی میں مندوبین، منتظمین اور دیگر مہمانوں کا ایک ہجوم تھا۔ کافی شاپ میں ناشتہ بوفے میں لگایا گیا تھا تاکہ وقت کی بچت ہوسکے۔ انڈوں کی زردی کا حلوہ، نمکین پنیر کا ڈھیر، جام اور مربّے، روائتی روٹی اور جوس دو میزوں پر سجے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی ناشتہ کیا اور کانفرنس ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ ہال میں داخلے پر سخت قسم کی سکیورٹی تھی۔ سیڑھیاں بالکل بند کردی گئی تھیں اور ہال چونکہ پہلی منزل پر تھا اس لیے ایک لفٹ کو پہلی منزل کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ میں اپنا کیمرہ کندھے پر لٹکائے ہوئے تھا۔ فریدہ اور فرح کا ہال میں جانا ممکن نہ تھا کہ اُنہیں کانفرنس کا کارڈ جاری نہیں ہوا تھا۔ اس لیے لابی میں بیٹھیں اور آئس کریم اور کافی میں شغل کریں۔ ہال کے باہر کاؤنٹر پر انھوں نے کیمرہ رکھوا لیا اور تصاویر کے بارے میں وعدہ لیا کہ مطلوبہ تصاویر وہ ہمیں خود مہیا کریں گے (یہ وعدہ آج تک ایفا نہیں ہوا) صدر علی خامنائی آرہے تھے اس لیے یہ تمام حفاظتی اقدامات کیے جارہے تھے ہال میں داخل ہوئے تو ایک پُرشکوہ منظر تھا۔ سٹیج کو بڑی سادگی اور وقار کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ قرآن کی ایک آیت نمایاں طور پر لکھی گئی تھی جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"اجازت دی گئی ان لوگوں کو کہ وہ قتل کریں ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیے
اور بے شک اللہ نے فتح کو اُن کا مقدر کردیا۔"

ہال کے دائیں طرف کی نشستیں خواتین کے لیے مختص تھیں اور ہال کے آخر میں چار پانچ بوتھ بنے تھے جس میں عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی کے مترجم بیٹھے تھے۔ ہر نشست پر واکی ٹاکی رکھا تھا جس کی مدد سے آپ کسی بھی زبان میں ہونے والی تقریر کا ترجمہ سُن سکتے تھے۔ پہلی قطار میں علمائے کرام بیٹھے تھے۔ اُن سے پیچھے کی قطاریں مندوبین کے لیے تھیں اور پھر

سفارت کار اور دیگر حکام کو بٹھایا گیا تھا۔ میں اور سید صاحب دوسری قطار میں جا بیٹھے۔ راجندر برن بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ میرے دائیں ہاتھ کی دو نشستوں پر ریزروڈ لکھا تھا اور میں حیران تھا کہ سب لوگ کسی بھی حفظِ مراتب کے بغیر بیٹھے ہیں پھر یہ دو نشستیں کس کے لیے مخصوص کی گئی ہیں پیچھے مڑ کر دیکھا تو سفیرِ محترم بھی بیٹھے تھے تاہم انہوں نے ابھی تک اپنے کسی افسر کو ہماری خیر و عافیت معلوم کرنے نہیں بھیجا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھی نشست بردار کون ہوں گے کہ دو سمارٹ سے نوجوان پتلون کوٹ پہنے، ہلکی ہلکی داڑھیاں ان نشستوں پر بیٹھ گئے۔ کانفرنس کا ایک منتظم اُنہیں بڑے ادب سے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ دو عالم سٹیج کا معائنہ کر رہے تھے۔ انہوں نے سٹیج کے آگے پڑے پھولوں کے گملوں کا بھی معائنہ کیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ دونوں نوجوان صدر ایران کے باڈی گارڈ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اپنے طور پر جیمز بانڈ 007 بنتے ہوئے اپنی دائیں کہنی کو ایک نوجوان کی کمر کے ساتھ لگایا وہ لمس پستول کی موجودگی کی یقین دہانی کرانے کے لیے کافی تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ صدر ہی کے باڈی گارڈ ہیں اور اب صدر کی آمد آمد ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہال میں ایک ہلچل سی محسوس ہوئی۔ صدرِ ایران علی خامنائی تشریف لا رہے تھے۔ وہ ایرانی علمائے کے روائتی ملبوس میں تھے۔ مجھے اس روز اس حقیقت کا علم ہوا کہ سفید پگڑی (عمامہ) باندھنے والے علماء غیر سید ہوتے ہیں اور شیخ کہلاتے ہیں جب کہ سیاہ پگڑی (عمامہ) باندھنے والے خانوادۂ سادات سے ہیں اور سید کہلاتے ہیں۔ علی خامنائی کے آتے ہی کیمروں کی فلیش دھڑا دھڑ چلنے لگیں۔ بعض کیمرہ مین بغیر فلیش کے کام چلا رہے تھے۔ بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اب ایسی فوٹوگرافی فلمیں ایجاد ہو چکی ہیں جن کو ایکسپوز کرتے وقت فلیش کی ضرورت نہیں ہوتی تو اپنی عدم معلومات پر خاصا افسوس ہوا۔ علی خامنائی سٹیج پر پہنچے۔ دو اور مستعد باڈی گارڈ سٹیج کے دائیں اور بائیں کھڑے تھے۔ سٹیج پر صدر کے علاوہ کانفرنس کے چیئرمین ڈاکٹر کمال، ڈاکٹر شمس اور سیکرٹری بیٹھے تھے۔ ایران کا قومی ترانہ بجایا جانے لگا اور ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ اس کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ تہران ٹی وی کے

ایک خوش الحان قاری نے تلاوت کی۔ کانفرنس کے چیئرمین نے علی خامنائی کو خطاب کی دعوت دی تو پورا ہال درود سے گونج اُٹھا۔ یہ بات خاصی متاثر کن ہے کہ ایرانی سیاسی جلسوں اور سرکاری اجتماعات میں بھی سیاسی نعرہ بازی کے بجائے صلوٰۃ کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ علی خامنائی نے مندوبین کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے خطاب کا آغاز کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ جارحیت ایک دردِ سر ہے اور پوری عالمِ انسانیت اور خاص طور پر ایرانی قوم ایک عرصے سے اِس دردِ سر میں مبتلا ہے۔ اُنہوں نے اس بات کو خوش آئند قرار دیا کہ اِنسانیت سے محبت کرنے والے سکالر اِس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ایران کے خلاف عراق کی یہ ۸ سالہ جارحیت دوسری عالمی جنگ کے بعد سب سے بڑی جارحیت ہے جس میں دو قومیں اپنے ذرائع اور قوت جنگ کی نذر کر رہی ہیں اگر دُنیا نے پہلے اِس مسئلے پر غور کر لیا ہوتا تو یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی جس کا آج سب کو سامنا ہے سکالروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مسئلے کا حل تلاش کریں تاکہ دوبارہ انسانیت اِس مصیبت میں مبتلا نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ لوگ عراق ایران جنگ کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں ملکوں کی سرحدوں کی بات کرتے ہیں، مذہبی اختلافات کا تذکرہ کرتے ہیں مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ جنگ ایران کے اسلامی انقلاب کے خلاف تھی۔ ہمیں اس تصادم میں ملوّث کرنے والے یہ چاہتے تھے کہ انقلاب کا عمل آہستہ کیا جائے۔ علی خامنائی دھیمے فارسی لہجے میں خطاب کر رہے تھے اور میں ایئر فون کانوں سے لگائے۔ اس تقریر کے انگریزی ترجمے سے نوٹس لے رہا تھا علی خامنائی نے کہا کہ جنگ کے آغاز میں عراق نے اصل عزائم کو چھپانے کی بے حد کوشش کی مگر وہ زیادہ دیر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور آخر صدام حسین نے یہ کہہ دیا کہ وہ اسلامی انقلاب کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔

اُن کے عزائم یہ بھی تھے کہ وہ ایران کا تیل پیدا کرنے والا علاقہ حاصل کریں اور اس طرح ایران کا جغرافیائی نقشہ تبدیل کریں۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے اپنی کتابوں پر نقشہ شائع بھی کروا دیا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ ایران کو اقوامِ متحدہ اور سلامتی کونسل کے کردار سے اس

بات کا علم ہوا کہ بڑی طاقتیں عراق کی پُشت پناہی کر رہی ہیں۔ اس ضمن میں سلامتی کونسل کی پہلی قرارداد یو این او کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے جو اس عالمی ادارے کے مستقبل کے لیے ایک سوال ہے۔ اِس قرارداد میں جارحیّت کے بارے میں کچھ نہیں کیا گیا، نہ جارح کی مذمّت کی گئی۔ صرف اتنا کہا کہ خون بہنا بند ہونا چاہیئے۔ ہماری ۱۳۰۰ کلومیٹر طویل سرحد پر جنگ ہو رہی ہے مگر ہمارے علاقے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا گیا۔ یوں اس بڑی جارحیّت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اِس کے بعد ایک اور قرارداد پاس کی گئی اس میں بھی جارح کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے ایرانی انقلاب کو ختم کرنے کے لیے عراق کی پُشت پناہی کی گئی مگر اس کے باوجود ہم نے تنہا آٹھ سال اپنی سرحدوں اور انقلاب کا دفاع کیا۔ دُنیا نے ہماری آزادی ختم کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے دیکھا کہ نہ انقلاب کمزور ہوا، نہ ہم تباہ ہوئے اگرچہ اس کی ہمیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے مگر ہم آزادی سے پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہیں اور اس وقت اپنی قوّت کے عروج پر ہیں۔ اس صورتِ حال کا دیانتدارانہ تجزیہ ہونا چاہیئے۔ عراق نے الجیریا معاہدے کو توڑا، دیگر معاہدوں اور کنونشنوں کی دھجیاں اُڑائیں کیمیائی بم مارے گئے۔ آبادیوں کو نشانہ بنایا گیا، مسافر جہاز اُڑائے گئے، الجیریا کے وزیر خارجہ کو دنیا کی آنکھوں کے سامنے مارا گیا۔ ہمارے وزیر تیل اور اس کے ساتھیوں کو یہ کہہ کر قیدی بنالیا کہ یہ فوجی ہے اور ہمیں ابھی تک اس کی کوئی خبر نہیں۔ یہ جارحیّت کی زندہ مثالیں ہیں کہ ہماری آبادیوں پر کیمیائی بم مارے گئے۔ ایسے ہی ایک واقعہ میں ۱۵۰۰ شہری شہید ہوئے۔ ان کے گھروں اور گلیوں کو میں نے خود دیکھا، میرے ساتھ دُنیا کے صحافی تھے۔ لاشیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں مگر دنیا نے کچھ نہیں کیا۔ عالمی سوسائٹی کے پاس ایسی کوئی عدالت نہیں ہے جہاں اس ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی جائے۔ جس سے انصاف مانگا جائے۔ یو این او نے بھی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ ایک مناسب وارننگ بھی نہیں دی گئی۔ ہماری آواز صدائے بازگشت ثابت ہوئی۔ سیاسی گروپوں نے بھی ان کے معاندانہ پراپیگنڈہ کی وجہ سے ہماری آواز پر کان نہیں دھرا۔ مشرق و مغرب میں سب نے نہ

صرف عراق کی حمایت کی بلکہ جب اسلحہ پر پابندی لگانے کی بات ہوئی تو یہ پابندی بھی ہم پر لگائی گئی۔ اِس کے باوجود کہ ہمارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ہم نے کامیابی سے دفاع کیا۔ عوام میں بددلی پھیلانے کی کوششیں بھی کی گئیں مگر آج یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ سڑکوں پر نکل کر انقلاب کی حمایت کرتے ہیں۔ حال ہی میں ہونے والی عیدِ غدیر کی تقریبات اس بات کی گواہ ہیں۔ اَب مَیں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں کہ کیا ہر ملک اس طرح اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ اگر نہیں تو یہ مسئلہ آپ سب کے سوچنے کا ہے۔ آج بھی دنیا کی بہت سی قوموں کے پاس اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں ہے مگر کوئی عالمی ادارہ ان کو دفاع کی صلاحیّت دینے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ادارے موقع پرست ہیں۔ لوگ چونکہ دانشوروں اور فنکاروں کو پسند کرتے ہیں اس لیے میرے خیال میں ایک عالمی ادارہ دنیا بھر کے فنکاروں اور سکالروں کو مل کر بنانا چاہیئے جس کی اپنی ایک اہمیّت ہوگی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اَب فنکار اور دانشور ہی انقلاب کا دفاع کر سکتے ہیں۔ اب جنگ تقریباً بند ہو رہی ہے۔ ہم نے سلامتی کونسل کے سیکرٹری جنرل کی بڑی مدد کی ہے۔ یہ آپ لوگوں کے لیے اچھا موقع ہے کہ کسی ایک عالمی ادارے کے قیام کے لیے کام کریں۔ ہم نے سلامتی کونسل کی قرارداد کا مثبت جواب دیا ہے مگر اس کے باوجود کہ عراق کا فوجی سربراہ جنگ بندی قبول کر چکا ہے۔ عراقی کہتے ہیں کہ انہیں ہم پر اعتبار نہیں ہے عراقیوں کا رویّہ ابھی تک مشکوک ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ سے جنگی جنون میں مبتلا رہے ہیں اُنہیں یقیناً معاہدے کا انتظار ہے۔ عراقی فوجی سربراہ شاید خود کو بہت طاقتور سمجھتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ وہ فوجی قوّت سے ایک اور حملہ کر کے ہماری زمین لے لیں گے مگر وہ غلطی پر ہیں۔ اگر انہوں نے دوبارہ حملہ کیا تو ہمارا جواب پہلے سے بھی زیادہ تلخ ہوگا۔ ہمارے پاس عوامی قوّت ہے جس کا جذبہ جوان ہے۔ جبکہ عراق کے پاس یہ قوّت نہیں ہے۔ ہم دن بدن اُن سے طاقتور ہو رہے ہیں۔ یہ صدام حسین کی فاش غلطی ہوگی وہ پہلے بھی ایسی غلطیاں کرتا رہا ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں عالمی رائے عامہ عراق پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ وہ جنگ بندی تسلیم کر لے چنانچہ وہ مجبوراً جنگ بندی قبول کریں گے۔

جنگ بندی سلامتی کونسل کی قرارداد کا حصّہ ہے جسے دونوں ملکوں کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لینا چاہیئے بعد میں مذاکرات کے ذریعے امن معاہدہ ہو سکتا ہے۔ ہم گفتگو کے لیے تیار ہیں مگر کوئی شرط قبول نہیں کریں گے۔ ہم یہاں امن کی جنّت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یاد رکھیئے کہ مجبور ہمیشہ اس وقت ہتھیار اُٹھاتا ہے جب اُسے تنگ کیا جائے۔ تمدنی دنیا کو یقیناً جارحیت روکنے کے طریقوں کی تلاش ہے مگر حکومتیں یہ کام نہیں کر سکتیں۔ یہ کام دانشوروں، فنکاروں اور انسانیت سے محبّت کرنے والوں کا ہے۔ ہم ہر اس کام میں شامل ہونے کو تیار ہیں جو امن کے قیام کے لیے ہو چاہے دنیا کا کوئی ادارہ بھی اس کا بیڑہ اُٹھائے۔ علی خامنائی کی تقریر کے دوران کئی بار دُرود کا وِرد کیا گیا اور سٹیج کے دائیں اور بائیں کھڑے ہوئے سیکورٹی گارڈز کا تبادلہ بھی ہوا۔ علی خامنائی اپنی صدارتی تقریر کے بعد کانفرنس کے بہتر نتائج کی اُمید کا اظہار کرتے ہوئے کانفرنس ہال سے چلے گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسا صدر ہے۔ سیدھا سا، سادا سا۔ نہ گردن میں خم ہیں، نہ گفتگو میں بناوٹ۔ صدرِ ایران کا دایاں ہاتھ پارلیمنٹ کے حادثے میں ناکارہ ہو چکا ہے اِس لیے وہ مصافحہ کے لیے بایاں ہاتھ ہی آگے بڑھاتے ہیں۔ صدر خامنائی کی تقریر کے ساتھ ہی کانفرنس کی افتتاحی تقریب ختم ہوئی۔ ہال میں گھومتے ہوئے دو ٹی وی کیمرے مندوبین اور مقررین کا احاطہ کر رہے تھے۔ ایک کیمرے کے پیچھے ایک جانی پہچانی سی شکل نظر آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نوجوان کو میں لاہور ٹی وی پر دیکھ چکا ہوں، بالکل پاکستانیوں جیسے خدوخال تقریب ختم ہوئی اور ہم لوگ ہال سے باہر پذیرائی کے لیے جانے لگے تو میں نے اس سے پُوچھ ہی لیا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور پھر مجھے اس کے جواب سے ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ پیدائشی طور پر ایرانی ہے۔ خدوخال اس لیے ایرانیوں سے ذرا مختلف ہیں کہ اس کی ماں ہندوستانی تھی۔ اس کا جواب چونکہ درست فارسی میں تھا اس لیے اس کے اس بیان پر شک وشبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ یہ اس کا ایک اہم نیوز آئیٹم ہے۔ پاکستان تو کسی اخبار یا بیرونی نیوز ایجنسی کے حوالے سے ایک دو روز بعد ہی پہنچے گی۔ کیوں نہ اسے لاہور روانہ کیا جائے اور

پھر مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ہوٹل ہی کے ایک کمرے میں ٹیلکس سروس کا اہتمام تھا جہاں ترکی، جاپان، یونان اور جرمنی کے نمائندے مختلف مشینوں پر اپنے اپنے اداروں کو خبر ارسال کر رہے تھے۔ میں بھی اللہ کا نام لے کر ایک مشین پر بیٹھ گیا۔ میرا زندگی کا پہلا موقع تھا کہ اُردو میں لیے گئے نوٹس کو انگریزی میں خبر کی صورت میں اپنے روزنامے کو بھجوا رہا تھا۔ ٹائپنگ سپیڈ اچھی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ دیر تو ضرور لگی مگر جب آخر میں یہ فقرہ ٹائپ کر کے فُل سٹاپ مارا کہ

THIS WAS AFZAAL SHAHID REPORTING FROM TEHRAN.

تو ایک گونہ خوشی ہوئی۔ اِس کام سے فارغ ہو کر پھر کھانے کی میز پر تھے۔ آج ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کوئی میز خالی نہ تھی۔ کھانا بھی بوفے میں تھا۔ ٹماٹر اور بینگن کا بھرتا اور پالک کے رول آج سب کی پسندیدہ ڈش ٹھہرے تھے۔ گوشت کے پسندے بھی مکھن کی کاشوں کے ساتھ سجے تھے اور سویٹ ڈش تھی ہاٹ چاکلیٹ۔ میں نے اور سری لنکا کے مندوب فیض مصطفےٰ نے اس کونے میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور وہاں ہماری ملاقات پہلی بار ایرانی مکھی سے ہوئی۔ وہ اِدھر اُدھر بھنبھناتی ہوئی پھرتی۔ ہم کانفرنس کے پروگرام پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ فیض مصطفےٰ کا خیال تھا کہ سلامتی کونسل جنگ بندی کی قرارداد کو اصولی طور پر تسلیم کر لینے کے بعد ایران نے سفارتی محاذ پر بھی اس جنگ کو جیت لیا اور اب کانفرنس یقیناً خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہو گی۔ کانفرنس کے پروگرام کے مطابق کانفرنس کو تین کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

(۱) اسلامی سٹڈیز کمیٹی

(۲) انٹرنیشنل افیئرز کمیٹی

(۳) پولیٹیکل اینڈ ہسٹوریکل سٹڈیز کمیٹی

اِس تقسیم کا مقصد یہ تھا کہ ایک ہی اجلاس میں درجنوں کے قریب سکالروں کے مضامین اور اُن پر بحث نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہر مندوب کو اپنی مرضی کے مطابق ان تینوں کمیٹیوں میں سے

کسی بھی کمیٹی میں جانے کی اجازت تھی۔ ان تینوں کمیٹیوں کے اجلاس ہوٹل کے مختلف ہالوں میں منعقد ہو رہے تھے۔ دوپہر کے کھانے پر ہماری ملاقات تہران میں اپنے سفارتخانے کے پریس اتاشی عبدالرؤف ملک سے ہوئی۔ موصوف پاکستان میں کنٹرولر آف نیوز پرنٹ رہ چکے ہیں لہذا تھوڑی بہت شناسائی پہلے سے تھی۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھایا اور پاکستان سے مدعوئین کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ سفیر صاحب ہم سب کو سفارتخانے میں بلانا چاہتے ہیں اور چائے وغیرہ کی دعوت کے خواہشمند ہیں۔ انہوں نے سیّد افضل حیدر کے گولڈ لیف کے پیکٹ کا وزن بھی خاصا ہلکا کیا۔ چونکہ گولڈ لیف اور کوئی بھی غیر ملکی سگریٹ وہاں میسّر نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے کئی بار منہ کا ذائقہ بدلا۔ وہ ہمارے کئی ایک سوالات کے جواب دینے سے گریزاں تھے۔ اُن کا انداز خاصا پُراسرار لگ رہا تھا جس نے ایک بار تو مجھے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ یہ کہہ کر اجازت لینے لگے کہ اَب سفارتخانے ہی میں ملاقات ہوگی مگر شاید یہ بھی ہمارے سفارتی آداب کا حصّہ ہے کہ وہ دن اور آج کا دن نہ تو سفارتخانے سے کسی نے ہمیں مدعو کیا اور نہ ہی یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ ہمارا حال ہی پوچھ لیا جائے۔ بالآخر ہم صاحبانِ قلم و ہنر ہیں اور ایران کی حکومت کی دعوت پر سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے آئے ہیں۔ ایک موقع پر جب سیّد افضل حیدر، ڈاکٹر حسنات نے اپنے سفارتخانے کی اس سرد مہری کا شکوہ کیا تو میں نے یہ کہہ کر اُنہیں دلاسہ دیا کہ وہ ایرانیوں کی مہمان نوازی سے واقف ہیں لہٰذا اُنہیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک ہی ہو رہا ہوگا۔ اس موقع پر مَیں نے اُنہیں یہ لطیفہ بھی سنایا کہ ایک وڈیرے نے کسی تقریب میں ایک معروف گوّیے کو گانے کے لیے بُلایا، گانا شروع ہوا تو میزبان خرّاٹے لینے لگے۔ فنکار سے بالآخر نہ رہا گیا اُنہیں ہلا کر جگایا اور کہنے لگا "حضور پانچویں ٹھمری گا چکا ہوں مگر آپ غالباً توجہ نہیں فرما رہے"

میزبان نے جواب دیا "بھائی! تم گاتے رہو مجھے تم پر یقین ہے۔" ہم بھی غالباً اسی یقین کا شکار ہوئے تھے۔ میرے لیے ایک بڑا مسئلہ کیمرے کی فلم تھا۔ پاکستان سے میں صرف

رول ساتھ لایا تھا اور گزشتہ تین روز میں، جس انداز سے مَیں نے تصویر کشی کی تھی سٹاک جواب دیدیا گیا تھا۔ ہوٹل کا کونا کونا چھان مارا۔ ہر دُکان سے فلم کا پوچھا مگر نہ تو رنگین فلم دستیاب تھی اور نہ ہی بلیک اینڈ وائٹ، بالآخر مجھے ایران کی وزارتِ ارشاد کے فوٹوگرافی یونٹ سے درخواست کرنا پڑی کہ مجھے ایک فلم مہیا کردیں مگر وہ بھی صرف حوصلہ ہی دیتے رہے۔ ہوٹل کی پہلی منزل پر فوٹوگرافی کی ایک دُکان بھی موجود تھی مگر دُکاندار صاحب شاید کانفرنس کے" خوف "سے دُکان بند کرکے چھٹی منا رہے تھے، میں نے تقریباً پانچ چکر لگائے اور اس کے ساتھ والی باربر شاپ پر کئی ایک پیغامات چھوڑے کہ ایک عدد رنگین فلم رول کے ساتھ وہ مجھے لابی میں تلاش کرلیں مگر یہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ بس حوصلے پر کام چلتا رہا کہ سید افضل حیدر اور ڈاکٹر حسنات اپنے اپنے کیمروں سے بخوبی کام لے رہے ہیں۔ فیض مصطفےٰ اور مَیں کھانا کھانے کے بعد لابی میں آئے تو راجندر سرین سے ملاقات ہوئی، خاصے پریشان تھے۔ سبب پُوچھا تو کہنے لگے میں ڈیڑھ سو ڈالر روزانہ کے حساب سے خرچہ لایا تھا مگر یہاں تو معاملہ بڑا گڑبڑ ہے۔ ایک ڈالر کے صرف سات تومان ملے ہیں جب کہ ٹیکسی والا ہوٹل سے شہر جانے کے ۲ سو تومان لیتا ہے۔ مجھے اپنی بیٹی کے لیے کچھ فیروزے وغیرہ بھی خریدنے ہیں۔ آخر یہ سب ہوگا کیسے؟ مجھے راجندر سرین کی بے بسی پر اظہار کرنے کا موقع ملنے سے پہلے ہی فیض مصطفےٰ نے بھی یہی مسئلہ میرے سامنے رکھ دیا اور جب میں نے اُنہیں اس مسئلے کا حل بتایا تو یہ اُن کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ راجندر سرین بولے اگر یہ درست ہے اور مارکیٹ میں کرنسی ایکسچینج کا یہی ریٹ ہے تو بھائی دیر کیوں کرتے ہو ہماری مدد کرو یہ تو نیکی کا کام ہے۔ میں نے ان سے شام کو اُنہیں "مالا مال" کرنے کا وعدہ کیا اور اُن سے مطلوبہ ڈالر لے لیے۔

شام کو جب میں اپنے اس تجارتی مشن پر روانہ ہوا تو مارکیٹ کا استحکام دیکھ کر مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ صرف دو روز ہی میں ریٹ ۷۰۰ ریال فی ڈالر سے ۵۲۰ ریال فی ڈالر تک آگیا تھا۔ بات فوراً سمجھ میں آگئی۔ یہ سب جنگ بندی کی قرارداد کے منظور ہونے کا نتیجہ تھا اور مارکیٹ میں

یہ بات عام تھی کہ آہستہ آہستہ کرنسی کا ریٹ ٹھیک ہوتا جائے گا اور پھر شاید وہ دن بھی آجائے جب سرکاری اور بلیک مارکیٹ کے نرخوں میں کوئی فرق نہ رہے اور یوں بلیک مارکیٹ خود بخود ختم ہو جائے مگر میں سوچ رہا تھا کہ کرنسی کے یوں مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ اشیا کے نرخ بھی کم ہوں گے تو توازن پیدا ہوگا۔ ورنہ مہنگائی ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جائے گی اور عدم توازن کی صورت میں ایران کی اقتصادی اور تجارتی صورتحال کو زبردست دھچکا لگے گا۔ ایران سے وطن واپسی پر میں نے خاص طور پر کرنسی کا ریٹ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہ اب ۴۰۰ ریال فی ڈالر کے قریب ہے اور یوں مجھے یقین ہوگیا کہ بلیک مارکیٹ واقعتاً ایک روز خود بخود ختم ہو جائے گی۔ بہرحال یہ اب ایرانی ماہرین اقتصادیات و تجارت کا مسئلہ ہے کہ وہ اس خاص مسئلے کو کس طرح حل کرتے ہیں اور عوام کی ضروریات اور ذرائع کے مطابق کیا اقتصادی پالیسیاں بناتے ہیں۔

کانفرنس کی پہلی کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا تو پولیٹیکل اور ہسٹوریکل کمیٹی کے اجلاس میں چونکہ امریکیوں کی تقریریں زیادہ تھیں اس لیے پاکستان مندوبین سمیت اس اجلاس میں خاصے لوگ شریک تھے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر جیمز بل نے وار، ریوولوشن اینڈ مورال کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر جیمز بل کا تعلق کالج آف ولیم اینڈ میری ورجینیا امریکہ سے ہے۔ یہی وہ جیمز بل ہیں جن کے بارے میں کانفرنس کے مندوبین میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ اگر کبھی امریکہ اور ایران کے سفارتی تعلقات بحال ہوئے تو جیمز بل ایران میں امریکی سفیر مقرر کیے جائیں گے۔ موصوف نے بڑے شاندار فارسی لہجے میں اپنی گفتگو کا آغاز کیا جسے سُن کر مجھے نہ صرف حیرت بلکہ اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ میں یوں فارسی بولنے اور سمجھنے سے قاصر ہوں۔ جیمز بل یوں بول رہے تھے جیسے فارسی اُن کی مادری زبان ہو۔ فارسی زبان پر اُن کی اس دسترس پر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے۔ راجندر سرین بھی اشاروں کنایوں سے حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ کانفرنس ہال کے دائیں حصے والی نشستوں پر خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں ایرانی خواتین کے علاوہ مہمان امریکی اور برطانوی خواتین

بھی تھیں۔ سب نے ایک جیسے لباس پہن رکھے تھے اور وہی اسلامی حجاب، رنگ بھی سُرخ و سپید لہٰذا یہ پہچان مشکل تھی کہ ان میں مقامی کون ہے اور غیر ملکی کون۔ برطانوی خاتون کا نام الزبتھ تھا اور ان کا تعلق بریڈ فورڈ یونیورسٹی سے تھا۔ ایک طویل القامت خاتون ایک مشنری کی بیوی تھیں اور یہ دونوں میاں بیوی بڑے ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھے۔ الزبتھ بھی خاصی ملنسار تھی مگر اس کا رویّہ بڑا محتاط تھا۔ ڈاکٹر حسنات کے ساتھ الزبتھ اکثر مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتی جب کہ فریدہ اور فرح کے ساتھ اس کا خاصا وقت دوستانہ ماحول میں گزرتا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے فریدہ اور فرح کی اسکے ساتھ دوستی ہوگئی ہے۔ اس کا اصل اندازہ اس وقت ہوا جب الزبتھ کو ڈائریا ہوگیا۔ ڈاکٹر اس کی بڑی اچھی دیکھ بھال کر رہے تھے مگر فریدہ اور فرح خاصی متفکر تھیں اور بار بار الزبتھ کے کمرے میں جاکر اس کی خیریت دریافت کرتی تھیں۔ اس وقت تینوں کانفرنس ہال میں موجود تھیں اور ڈاکٹر جیمز بل کا مقالہ سُن رہی تھیں کانفرنس ہال میں میزوں پر پانی کے جگ اور گلاس بھی رکھے تھے اور میں ایران کے پانی سے اس حد تک لُطف اندوز ہو رہا تھا کہ اس کے ذائقے سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے پیاس کے بغیر بھی پانی پینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

ایران میں پانی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک پانی سمندری ہے جس میں تیل کی آمیزش بھی موجود ہے۔ یہ پانی صرف کپڑے دھونے اور نہانے وغیرہ کے کام آتا ہے جب کہ پینے کا پانی خالص معدنی اور فرحت بخش ہے۔ بھوک اتنی شدّت سے لگتی ہے کہ سُبحان اللہ۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ایران جاکر ناشتہ نہ کرنے کی جو عادت گزشتہ آٹھ برس سے روزمرّہ زندگی کا حصّہ بن چکی تھی ایک بار تبدیل ہوگئی اور جب تک ناشتہ نہ ہوتا جسم میں کپکپی سی لگی رہتی۔ ڈاکٹر جیمز بل کے مقالے کا موضوع ہی ایسا تھا مگر جب وہ فلسفۂ شہادت پر بڑے تسلسل کے ساتھ مدلّل انداز میں تقریر کر رہے تھے تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ امریکی ایسے بھی ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے میں واقعۂ کربلا کے حوالے سے جہاد اور شہادت کے موضوع پر بڑا سیر حاصل لیکچر دیا۔

ایران کے سلامتی کونسل کی قرارداد کو منظور کر لینے کے بعد اُن کا خیال تھا کہ دس برس بعد پوری

دُنیا اس اقدام پر ایران کی حمایت کرے گی۔ اُنہوں نے کہا کہ اس کے باوجود کہ ستمبر ۸۰ء میں عراق نے اپنے ۲ لاکھ ۱۲ ہزار ۹ سو ۸۰ فوجیوں کی قوت کے ساتھ ایران پر حملہ کیا تھا اور اس میں عراق کو سُپر پاور سمیت دنیا کے کئی ممالک کی کُھلی حمایت حاصل تھی مگر ستمبر ۸۸ء آنے کے عراق اپنے منصوبوں کے مطابق ابھی تک ایران کے کسی علاقے کو عراقی نقشے میں شامل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایرانی فوجیں جذبۂ شہادت کے تحت جہاد کر رہی ہیں جبکہ عراق بلاشبہ جارح ہے اور ظالم کا کردار ادا کر رہا ہے۔ ایرانی فوجوں کو اس فلسفے کی انسپائریشن کربلا سے ملی ہے جہاں ان کے امامؑ اور رسولؐ کے نواسےؑ نے ظالموں کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی اور شہادت کا جام پی کر انسانیت کے اعلیٰ اصولوں کو قائم رکھا تھا

دوسرے مقرر اے آر شیخ الاسلامی تھے۔ اُنہوں نے عراق ایران جنگ کے دوران خلیج کی دیگر ریاستوں کے کردار پر ایک اچھا مقالہ پڑھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ ویت نام کی جنگ کے بعد سب سے زیادہ اسلحہ خلیج میں لایا گیا اور استعمال کیا گیا۔ انہوں نے بعض تخمینے بھی پیش کیے جن کے مطابق ۱۹۸۵ء تک عراق ایران جنگ کی وجہ سے سعودی عرب کی تیل کی پیداوار میں ۲۰ فیصد کمی واقع ہوئی۔ جبکہ سعودی عرب کی فی کس آمدنی ۴۰ فیصد سے بھی زیادہ کم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب ان عرب ریاستوں کے رویّے کی وجہ سے ہوا۔ اگر انہوں نے اس جنگ میں متوازن رویّہ اختیار کیا ہوتا اور ایک اسلامی ملک کے خلاف ایک اشتراکی ملک کی حمایت نہ کی ہوتی تو شاید صورت حال اس سے مختلف ہوتی۔ انہوں نے بتایا کہ عرب ریاستوں سعودی عرب، کویت وغیرہ نے عراق کو اس جنگ میں کم سے کم ۷۰ ارب ڈالر کا سرمایہ فراہم کیا جو اس اسلحہ کے علاوہ ہے جو سعودی عرب سے ٹرلیوں کے ذریعے کویت کے راستے عراق کو بھیجا جاتا رہا۔ ایک اور امریکی سکالر جیمز پیکاٹوری نے اپنے مقالے میں کہا کہ اس جنگ سے نپولین اور ہٹلر کے زمانوں کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ جن کا مقصد بھی صرف جارحیت اور توسیع پسندی تھا۔ وہ پوری دنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھتے تھے اور اس جنگ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عراق نے جارح کا کردار ادا کیا ہے۔

جبکہ ایران کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے ملک کی جغرافیائی حدود کا دفاع کرے۔

انہوں نے کہا کہ صدام حسین کے ارادوں اور کردار نے غیر تمدّنی زمانے کی یاد تازہ کر دی ہے جب جنگجو بادشاہ اور قبائل سردار صرف اپنی سلطنتوں کی حدود میں اضافہ کرنے کی خاطر ہزاروں انسانوں کا خون کر دیتے تھے۔ جرمن سکالر ڈاکٹر راسمز نے اپنے لیکچر میں کہا کہ دُنیا کو شروع میں ایرانی انقلاب کی سمجھ نہیں آئی اور یہی ایک بڑی وجہ تھی جو عراق ایران جنگ میں بیرونی دُنیا کی براہِ راست شرکت اور جنگ میں شدت کا باعث بنی۔ دراصل ایران کے اسلامی انقلاب نے سُپر پاورز کو بھی پریشان کر دیا تھا اور عراق میں چونکہ ایک اشتراکی گروہ کی حکومت قائم ہے اور وہاں بھی مسلمان اور خاص طور پر شیعہ مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لیے اشتراکی حکمرانوں کے لیے اس بات کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اس انقلاب کے اثرات اُن کی سرحدوں تک نہ پھیل جائیں۔ یہی خدشہ خلیج کی دیگر اسلامی ریاستوں کو بھی تھا کیوں وہاں بھی بادشاہت اور ملوکیت قائم ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے سراسر منافی ہے۔

اِن کمیٹی میٹنگوں کا طریقہ کار یہ بنایا گیا تھا۔ ایک مقالہ نگار جب اپنا لیکچر ختم کر لیتا تو پھر مندوبین کو مدعو کیا جاتا کہ وہ مقالے کے کسی خاص نقطے کی وضاحت یا کوئی سوال کرنا چاہیں تو ڈائس پر آکر خود سوال پوچھیں

ڈاکٹر زیدی شاید اس بات کے انتظار میں تھے۔ اُنہوں نے فوری طور پر مائیک سنبھالا اور عراق ایران جنگ میں امریکہ کے کردار پر ایک اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ انہوں نے امریکی کردار کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب کیا دھرا امریکہ اور اس کے حواریوں کا ہے۔ امریکہ سب سے بڑا اسلام دشمن ہے اور جب تک اس کی مداخلت موجود رہے گی۔ دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس پر جیمز بل نے کہا کہ سب امریکی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ امریکہ میں بھی ایک لابی ایسی موجود ہے جو حقائق کا تجزیہ کرتی ہے اور ظالم اور مظلوم کا فرق سمجھتی ہے۔ عراق ایران جنگ میں امریکی مفادات

تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود نے کہا کہ شاہ ایران نے امریکہ کو ۲۵ برس میں ۲۵ ارب بیرل تیل فراہم کرنے کی گارنٹی دے رکھی تھی اور یوں ہم اپنے ہی تیل کے کنوؤں کے غلام بن کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں مغربی صحارا ، نمیبیا ، اری ٹیریا ، مڈل ایسٹ اور عراق ایران جنگ کے تنازعوں کا حوالہ دیا اور کہا کہ یہ سب تنازعات بڑی طاقتوں کے پیدا شدہ ہیں اور ان ممالک کے عوام بلاوجہ ان تنازعات کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

قم یونیورسٹی جسے حوزۂ علمیہ قم کہتے ہیں۔ ایران کی ایک بہت بڑی علمی درسگاہ ہے یہاں سے اسلام ، علمِ دینیات ، تاریخ ، فلسفے ، سیاسیات اور عالمی امور پر کمال دسترس رکھنے والے علماء کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ اس کانفرنس کے منتظمین میں حوزۂ علمیہ قم کے علما بھی شامل تھے اور ہر کمیٹی یا اجلاس میں ان کا نمائندہ ضرور شامل ہوتا۔

دمشق سے آئے ہوئے ایک سکالر نے ان تنازعات کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بہت سی قوموں میں انقلاب کی رُوح بیدار ہوئی ہے۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ایک اور حوصلہ افزاء بات یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں اپنی قومی دولت کو سنبھالنے کی سوچ پیدا ہوئی ہے اور وہ استعماری قوتوں سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ دنیا کی تمام بادشاہتیں یقینی طور پر ختم ہوں گی کیونکہ اب ان سلطنتوں کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ مقالوں کے بعد بحث و تمحیص کا سلسلہ شروع ہوا۔ زیدی صاحب ایک مرتبہ پھر جوش میں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جیمز بل نے یقیناً اچھا مقالہ پڑھا ہے اور اس کی فلسفۂ شہادت پر دسترس بھی خُوب ہے مگر کیا ہی اچھا ہو جیمز بل صاحب یہ فلسفہ امریکیوں کو پڑھائیں کیونکہ ہم اس فلسفے سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور اُن سے بہتر اس پر عمل کرنا جانتے ہیں۔ کانفرنس کے ایک اور مندوب سوئٹزرلینڈ کے البرٹ احمد تھے۔ یہ پیشہ کے اعتبار سے صحافی ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں جامعہ الازہر مصر سے اسلام قبول کیا تھا۔ اُن کی بیوی کا تعلق بھی مصر سے ہے جو سوئٹزرلینڈ میں مصری سفارت خانے میں سیکنڈ سیکرٹری تھیں۔ یہیں ان کی محبت کا

آغاز ہوا جو البرٹ ایگلر کو البرٹ احمد بنانے پر ختم ہوا۔ اجلاس ختم ہوا تو میں نے ریفریشمنٹ ہال میں علماء کو زمین پر بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے تھے اور چائے کافی پی رہے تھے یہ ایران کی وہ لیڈر شپ ہے جس پر قوم کے مذہبی، اخلاقی اور سیاسی کردار کو بہتر بنانے کی ذمہ داری ہے۔ مجھے یہ گروپ اس طرح دائرے میں بیٹھا بہت اچھا لگا۔ میں نے سلام کیا۔ سب سے ہاتھ ملائے اور ان کے درمیان بیٹھ گیا اور ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ میری ایک تصویر بنا دیں۔ کھانے کی میز پر ایک بار پھر گرما گرم بحث تھی۔ البرٹ احمد اپنے مسلمان ہونے کا قصہ بیان کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کا باپ بچپن ہی میں اُن سے کہتا تھا کہ چرچ کی احمقانہ باتوں پر غور نہ کرنا۔ خدا ایک ہے۔ مسیحؑ بھی، ابراہیمؑ بھی موسیٰؑ کی طرح پیغمبر اور ہماری طرح کا انسان تھا۔ خدا کا بیٹا نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جب اسلام قبول کیا تو انہیں پتہ چلا کہ یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات ہیں۔ البرٹ احمد کو قادیانیوں کے مسئلے پر خاصی تشویش تھی وہ بڑی تفصیل کے ساتھ قادیانیوں کے بارے میں جاننا چاہتے تھے اور سیّد افضل حیدر انہیں بڑی تفصیل کے ساتھ مطلوبہ معلومات بہم پہنچا رہے تھے۔ اس موقع پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک سوال جو البرٹ کے مسلمان ہونے کا علم ہونے کے بعد سے میرے ذہن میں تھا اب پوچھنا لازمی تھا۔ "مسٹر البرٹ آپ نو مسلم ہیں۔ آپ نے یقیناً مسلمانوں کے مختلف دینی گروہوں پر تحقیق کی ہوگی۔ یہ بتایئے کہ اس فرقہ بندی کو آپ کیا سمجھتے ہیں" میرے اِس سوال پر البرٹ احمد یوں گویا ہوئے

"مَیں بنیادی طور پر دو ہی گروہوں کو معتبر جانتا ہوں۔ شیعہ اور سُنی میں نے حال ہی میں تفصیلی مطالعہ شروع کیا ہے۔ میرے خیال میں ان دونوں گروہوں کے درمیان کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ مَیں خود اب تک ۵۰ فیصد سنی اور ۵۰ فیصد شیعہ ہوں مگر جُوں جُوں شیعیت کا مطالعہ کر رہا ہوں اس پر یقین کرتا جا رہا ہوں۔ تاریخ پر ان کا کلیم مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ تاہم مجھے اس بات پر اتفاق نہیں ہے کہ مسلمانوں کا کوئی بھی گروہ ایک دوسرے کو جھوٹا ثابت کرے اور ایسا کرنے میں اپنے مسلمان بھائی کا خون بہانے سے بھی گریز نہ کرے۔ بالآخر کلمہ تو ہمارا ایک ہی ہے۔

رسولؐ اور کتاب تو کوئی فرق نہیں" البرٹ احمد کی یہ باتیں سُن کر میرے دل میں معاً یہ خواہش پیدا ہوئی کہ البرٹ کو اپنے ہاں کا دورہ کرایا جائے اور اپنے ہاں کے تمام فرقوں کے علماء کو سامنے بٹھا کر البرٹ کی باتیں سنائی جائیں، شاید انہیں خوفِ خدا آ ہی جائے اور شیعہ، سُنّی، بریلوی، دیوبندی، چکڑالوی، وہابی اور نہ جانے کس کس گروہ کے نام کی صداقت پر ایک دوسرے کی پگڑی اُچھالنے اور خون بہانے کا سلسلہ ختم ہو سکے مگر شاید ہماری یہ خواہش اگلی چند صدیوں میں ہماری نسلیں پُوری کر دیں جس کے بارے میں ماہرینِ عمرانیات کا خیال ہے کہ شاید آیندہ چند صدیوں میں دنیا میں مذہب کا نام و نشان بھی نہ ہو جس طرح بعض تحقیقات کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ ۷ ہزار سال قبل دنیا کے کسی کونے میں مذہب نام کی کوئی شئے نہیں تھی۔ اسی روز اس ایرانی نوجوان سے بھی ملاقات ہوئی جسے فرانسیسیوں نے کئی ماہ سفارت خانے میں مقید رکھا تھا اور جو تن تنہا پوری فرانسیسی ایجنسیوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ حامد نامی اس نوجوان پر فرانسیسی ایران کے لیے جاسوسی کا الزام لگا رہے تھے مگر اس خُوبرو نوجوان نے نہ صرف ان کا مقابلہ کیا بلکہ رہائی بھی حاصل کی اور وہ آج میرے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کی زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے ٹی وی کے خبرنامے کو بطور خاص دیکھا کرتے تھے اور اخبارات میں اس کے بارے میں باکس تلاش کیا کرتے تھے یہ نوجوان کئی ماہ دنیا بھر کے ناظرین اور قارئین کی توجہ کا مرکز بنا رہا تھا۔ آج رات کے کھانے کی دعوت انسٹیٹیوٹ آف پولٹیکل اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز کی جانب سے تھی۔ انسٹیٹیوٹ تہران کے شمال میں واقع ہے یہ علاقہ سطح سمندر سے تہران کے دیگر علاقوں کی نسبت اُونچا اور سرد ہے۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب بیشتر مندوبین نے گرم کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ یہ انسٹیٹیوٹ ۱۹۸۲ء میں قائم کیا گیا تھا۔ جو مقامی اور غیر مقامی یونیورسٹیوں اور تحقیقاتی اداروں کو سیاسی اور عالمی امور پر تحقیقی معاونت اور مشاورت فراہم کرتا ہے۔ انسٹیٹیوٹ کے زیرِ اہتمام سیمینار اور تربیتی کورس منعقد کیے جاتے ہیں۔ انسٹیٹیوٹ ایک انگریزی مجلہ "ایرانی جرنل آف انٹرنیشنل افیئرز" اور ایک فارسی مجلہ "سیاستِ خارجی" بھی شائع کرتا ہے۔

اس کے علاوہ رپورٹیں اور کتابیں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ انسٹیٹیوٹ کی لائبریری میں دنیا بھر سے منگوائی گئی کتابیں ریسرچ سکالروں کی مدد کے لیے رکھی گئی ہیں۔ ادارے کے سٹاف میں ۱۰۰ کے قریب سفارت کار ریسرچ سکالر اور ماہرین شامل ہیں جو مہمان سکالروں کے علاوہ ہیں ہماری بسیں اُسی ترتیب اور تزک و احتشام کے ساتھ ہوٹل سے نکلیں اور شمیران کے علاقے کی جانب روانہ ہوئیں جہاں یہ انسٹیٹیوٹ قائم کیا گیا ہے۔ اس سٹریٹ کا نام شاہد آغائی سٹریٹ تھا۔ (مجھے خوشی ہوئی کہ تہران کی کسی سڑک کا نام خاکسار کے نام پر بھی ہے)

مَیں اور ڈاکٹر حسنات چونکہ تھوڑی دیر سے ہوٹل سے باہر نکلے تھے لہذا بسیں روانہ ہو چکی تھیں چنانچہ ہمیں کمانڈوز کی گاڑی میں بیٹھنا پڑا جو اِن بسوں کا تعاقب کر رہی تھی۔ شمیران کے علاقے میں داخل ہوتے ہی سرد ہوا کے جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا۔ راستے میں ایک جگہ چراغاں کا منظر دیکھ کر ٹھٹکے، ایک پاسدار نے بتایا کہ آج یہاں یا تو کسی شہید کی لاش آرہی ہے یا پھر خبر آئی ہے کہ انقلاب کا کوئی جیالا محاذ پر شہید ہو گیا ہے۔ یہ امام بارگاہ یا مسجد نما عمارت تھی۔ یہاں کی چہل پہل دیکھ کر ان کے جذبوں کو صد سلام کیے اور آنکھیں بے ساختہ بھر آئیں۔ انسٹیٹیوٹ کی عمارت بے حد کشادہ اور خوبصورت ہے۔ بڑی عمارت کے سامنے ایک طویل و عریض سرسبز باغ ہے جس کے بائیں کنارے پر ایک اور عمارت ہے جس کے سامنے ایک بڑا سوئمنگ پول بھی ہے۔ باغ میں چاروں طرف میز اور کُرسیاں لگا دی گئی تھیں اور دو بڑی میزوں پر کھانے کا اہتمام تھا۔ ڈاکٹر شمس نے مندوبین کو خوش آمدید کہتے ہوئے انسٹیٹیوٹ کا تعارف کروایا اور پھر وہی پُر تکلّف کھانا اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ عمارت یقینی طور پر ماضی میں کلب کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی۔ مَیں ہاتھ دھونے کے بہانے چھوٹی عمارت میں گیا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ وہاں بار کاؤنٹر بھی بنا تھا اور ڈانسنگ فلور بھی تھا۔ یہ علاقہ چونکہ تہران کے امراء کا علاقہ ہے اس لیے اس قسم کی عمارت کا یہاں ہونا عین ممکن ہے۔ میں نے واپس آکر شاہ جی کو بتایا تو وہ بھی میرے خیال کی تائید کرنے لگے، ہمارے پاس اپنے خیالات کی تائید کے لیے سوئمنگ

پلول کا ہونا سب سے بڑی دلیل تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہوٹل واپسی ہوئی۔ کافی پینے کیلئے ریسٹورانٹ میں گیا تو وہاں ایک لبنانی عالم اور بیروت یونیورسٹی کے ڈاکٹر سیمر سلیمان سے گفتگو ہوئی لبنانی عالم صرف عربی اور فارسی جانتے تھے۔ دراز قد خوبصورت سُرخ و سفید رنگ چھ فٹ کے قریب قد، سیاہ عمامہ اور قبا زیب تن کیے ہوئے بار بار میری انگوٹھی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور ایک بار تو اُنہوں نے کہہ بھی دیا کہ مجھے تحفے کے طور پر دے دو مگر میں نے بھی چونکہ تحفے ہی کے طور پر قبول کی تھی اس لیے معذرت کر دی۔ ڈاکٹر لیمر ترجمہ کر کے میری گفتگو لبنانی عالم تک پہنچاتے رہے۔ میں نے اُنہیں دعوت دی کہ وہ پاکستان کا دورہ کریں اور ایک اُردو مترجم کے ساتھ یہاں مجالس پڑھیں۔ ایک دو برس میں لکھ پتی ہو جائیں گے کیونکہ ہمارے ہاں یہ سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار ہے۔ علم بھی پھیلاؤ اور پیسے بھی کماؤ۔ اِس ضمن میں ہمارے بعض علماء اور ذاکرین کا شمار پاکستان کے متموّل ترین شہریوں میں ہوتا ہے۔ ہمارا تو شاعر یار محسن نقوی ہی مان نہیں۔ ۳۵ ہزار تمن کی تو انگوٹھی پہنے گھومتا ہے۔

میری یہ پیشکش لبنان کے حالات کے پیشِ نظر خاصی دلکش تھی۔ ڈاکٹر لیمر نے بتایا کہ لبنان بالکل تباہ ہو چکا ہے۔ کسی زمانے میں ۵ لبنانی پونڈ ایک ڈالر کے بدلے مل جاتے تھے مگر اب تبادلے کا نرخ ۳۵۰۰ لبنانی پونڈز کے بدلے ایک ڈالر کا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ فیکلٹی آف لیٹرز میں پروفیسر ہیں مگر اُن کی تنخواہ ۲۵۰۰ ڈالر سے صرف ۳۰۰ ڈالر رہ گئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اتنی بربادی اور تباہی کے باوجود لبنانی اب بھی اپنی زندگی کے اطوار بدلنے کو تیار نہیں۔ کلبیں اور شراب خانے آج بھی جُوں کے تُوں قائم ہیں اور اتنی بربادی نے بھی اُن کے ذہنوں پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈالا۔ لبنانیوں سے گپ شپ لگا کر چہل قدمی کرنے ہوٹل سے باہر نکلا تو عبدالکریم اور مصطفےٰ فیض ونڈو شاپنگ کر رہے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔ اتنے میں عبدالکریم نے اپنی جیب میں سے ایک لفافہ نکالا جس میں کم و بیش پاؤ بھر اجوائن تھی۔ ایک چُٹکی نکال کر مُنہ میں ڈالی اور ہمیں بھی پیش کی۔ یوں تو تہران کا پانی سب اچھا ہی کر رہا تھا مگر

عبدالکریم، الزبتھ کے ڈائریا کی وجہ سے قدرے متفکر تھے لہذا مُنہ کا ذائقہ "کڑوا" کرنے کے لیے ہم نے بھی اجوائن چکھ لی۔ آدھ گھنٹہ چہل قدمی کے بعد جب کمرے میں پہنچا تو معاً خیال آیا کہ آج کی مصروفیات کے نوٹس لکھ لیے جائیں۔ نیند سے جاگ کر ضروری نہیں کہ سب کچھ یاد رہے۔ ہر طرح کے اُلٹے سیدھے لطیفے، گندی سندی باتیں، اچھے بُرے شعر اور برسوں پہلے وقوع پذیر ہونے والے واقعات من وعن یاد رکھنے کے لیے بندے کا امجد اسلام امجد ہونا بے حد ضروری ہے۔ نوٹس لکھنے بیٹھا تو ساتھ ہی ٹی وی آن کر لیا۔ خبرنامہ چلنے والا تھا۔ خبرنامے میں لیڈ کی سٹوری آج کی کانفرنس ہی تھی۔

رات کے بارہ بج گئے اور میں نیند کی آغوش میں جانے کی کوشش کرنے لگا۔

آج اخبارات نے کانفرنس کی افتتاحی تقریب کو نشہ سُرخیوں سے شائع کیا تھا۔ رسالت، تہران ٹائمز، کیہان انٹرنیشنل، اطلاعات اور دیگر اخبارات کی لیڈ کی سٹوری یہی عالمی کانفرنس تھی۔ علامہ عارف الحسینی کے بارے میں ابھی تک ادارتی نوٹس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس ضمن میں خبریں بھی آ رہی تھیں اور ایرانی زعماء کے بیانات کا تسلسل بھی ابھی قائم تھا۔

آج کے اجلاسوں میں، سب سے پہلے ابتدائی اجلاس تھا جس میں تمام کمیٹیوں کے مندوبین اور مقررین موجود تھے۔ آج بھی پہلی باری امریکی مندوب ہی کی آئی۔ یہ ڈاکٹر ملٹن بوفنگٹن تھے جنہوں نے عراق اور ایران جنگ میں جنگی جرائم کے بارے میں مقالہ پڑھا۔ اجلاس کے شروع ہونے سے پہلے حسبِ معمول تلاوتِ کلامِ پاک ہوئی۔ پھر علامہ عارف الحسینی کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ ڈاکٹر ملٹن نے اپنے مقالے میں جی بھر کر عراق کے لتے لیے اور اسے گھناؤنے جنگی جرائم کا مجرم قرار دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ عراق نے بے گناہ شہریوں پر نہ صرف بمباری کی بلکہ ان کو کیمیائی ہتھیاروں کا نشانہ بنایا جو ہر طرح سے جنگی اصولوں اور انسانی ضابطوں کے خلاف ہے وہ بار بار میرا خون اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات ساری دنیا کو معلوم ہے کہ امریکہ نے خلیج میں اپنے حواریوں کی وساطت سے عراق کو ہر طرح کا جنگی ساز و سامان مہیا کیا اور رہر

فورم پر ایران کی صریحاً مخالفت اور عراق کی عمداً حمایت کی پھر یہ امریکی کس ڈھٹائی سے ان مظالم کا اور ہتھیاروں کا تذکرہ کر رہا ہے۔ جو عراق نے امریکہ ہی کی شہ پر استعمال کیے۔ کانفرنس کے ضوابط کے مطابق میں نے ڈاکٹر ملٹن کی تقریر کے دوران ہی اپنا نام لکھ کر اجلاس کے سیکرٹری کو بھیج دیا۔ ڈاکٹر ملٹن نے تقریر ختم کی تو انہیں سٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ اب سوالات کی باری تھی سب سے پہلے میرا نام پکارا گیا۔ میں نے ڈائس پر جا کر امریکی مندوب سے سوال کیا کہ محترم آپ کی تقریر بڑی معلومات افزا تھی مگر خدارا مجھے یہ بتایئے کہ آپ نے اپنی تقریر میں جن خوفناک ہتھیاروں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ ہتھیار کون بناتا ہے، کون انہیں عالمی منڈی میں فروخت کرتا ہے اور یوں انسانیت کی تباہی کا سب سے بڑا ذمہ دار کون ہے۔ میرے اس سوال پر ہال میں موجود پاکستانی مندوبین نے خاص طور پر اور دیگر حاضرین نے عمومی طور پر ڈیسک بجائے۔ ڈاکٹر زبیدا زیدی سب سے زیادہ خوش تھے۔ اُنہوں نے مجھے شاباش بھی دی تاہم میرے سوال کے جواب میں ڈاکٹر ملٹن نے صرف اتنا کہا کہ ہر وہ ملک جس کے پاس فرٹیلائزر بنانے کا پلانٹ ہے، گیس کے ہتھیار بنا سکتا ہے۔ دوسرے ہتھیار کون بناتا ہے اور کہاں سے آتے ہیں؟ مجھے علم نہیں۔ سب نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر ملٹن صاف پہلو بچا گئے ہیں۔ پہلے اجلاس کے بعد وقفہ ہوا تو کافی کا کپ ہاتھ میں پکڑے ڈاکٹر ملٹن میرے پاس آئے۔ کہنے لگے آپ نے بڑا اچھا سوال کیا تھا مگر آپ جانتے ہیں ہماری مجبوریاں کیا ہیں۔ اس جواب سے خدانخواستہ میرا مقصد آپ کو جھٹلانا نہیں تھا۔ حقیقت آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی، مگر کیا کریں۔

WE DO HAVE SOME LIMITATIONS

میں نے دل میں سوچا ڈاکٹر ملٹن کاش تم لوگوں میں اتنا حوصلہ پیدا ہو جائے کہ تم یہ وضاحتیں سرِ عام کر سکو۔ اتنی بڑی جمہوری مملکت کا دعوئ اور اظہار رائے میں اتنی کنجوسی۔ تم سے تو ہم غریبوں کے خاور نعیم ہاشمی اور جہانگیر بدر ہی اچھے، جنہوں نے کوڑے کھانے قبول کر لیے

مگر اپنی کومٹمنٹ کو نہیں چھوڑا۔ دوسرے مقرر محمد تقی جعفری تھے انہوں نے جنگ اور انسانی فطرت کے موضوع پر انتہائی خوبصورت تقریر کی۔ اُنہوں نے نطشے، ہیگل اور میکاولی کے فلسفوں کو سامنے رکھ کر انسان کے جنگی جنون کا انتہائی متاثر کن انداز میں تجزیہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ لوگ اس فلسفے پر متفق ہیں کہ

WAR IS FATHER OF EVERY THING AND PROVIDES SEED FOR GROWTH

اور یہ کہ جنگ انسانی فطرت کا حصّہ ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اگر اس فلسفے کو درست مان لیا جائے تو پھر دنیا بھر کے امن پسندوں کو بیمار سمجھنا چاہیئے۔ شہید بہشتی یونیورسٹی ایران کے ڈاکٹر رضا شعبانی نے ذہاب ٹریٹی سے اب تک عراق ایران جھگڑے کا تفصیلی احاطہ کیا انہوں نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ تقریباً تین ہزار سال پہلے اِس علاقے کا نام رکھا گیا تھا جس کا ایک تہائی حصّہ پہاڑی ہے اور ایک چوتھائی ریگستان تھا۔ اس علاقے کے جفاکش لوگوں نے سخت محنت کے بعد ان ریگستانوں کو سرسبز و شاداب علاقوں میں بدلا ہے۔ آج بھی تقریباً ہر شہر میں پہاڑی سلسلے موجود ہیں جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان پہاڑیوں اور ریگستانوں کو وادیوں میں بدلنے میں اس قوم کا خون پسینہ کس انداز میں بہا ہے۔ تاریخ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس خطے کی شادابی نے بیرونی حملہ آوروں کو اس کی طرف متوجہ کیا اور ایک ہزار سال قبل مشرق کی جانب سے حملہ آور یکے بعد دیگرے کرتے رہے۔ اس عمل میں اس خطے کے تقریباً ۳۵ معروف بادشاہ، جرنیل یا کمانڈر مارے گئے۔ مغرب کی جانب سے پہلا حملہ ۴۹۰ قبل مسیح میں ہوا۔ جب یونانیوں نے اس خطے پر حملہ کیا پھر سکندر اعظم نے اسے فتح کیا۔ پھر ترکی کے بعد ایران میں بھی سلجوقی آئے مگر کوئی جارح اس قوم کی وطن پرستی کو بادشاہ دوستی میں تبدیل نہ کر سکا۔

عراق ایران جنگ کی بنیادی دراصل ذہاب معاہدہ ہے جو ۱۶۳۹ میں شاہ صفوی کے زمانے میں ہوا تھا۔ اِس معاہدے کو ایران اور عراق کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس

ضمن میں دو خطوط موجود ہیں۔ ایک خط شاہ صفوی کا شاہ مراد چہارم کے نام ہے۔ اس زمانے میں خطوں کے ذریعے معاہدے ہوا کرتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس دور میں ایران کا علاقہ خاصا وسیع تھا اور ان معاہدوں کی روشنی میں ایک ہزار سال کا زمانہ بالکل پُرامن رہا۔ لیکن نادر شاہ کے قبضے کے بعد ترکوں سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ کربلا اور نجف کے بارے میں ایرانی بچّے ہمیشہ یہ گایا کرتے تھے کہ ایک دن کربلا اور نجف جانا ہے۔ قاچار کے زمانے میں تین مرتبہ مذاکرات کیے گئے۔ روس اور برطانیہ بھی اس جھگڑے میں ملوّث رہے وہ ایران کے بجٹ سے کچھ لینا چاہتے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد آٹمنز کی حکومت بکھر گئی وہ یہاں کسی شہزادے، یا سلطان کی تلاش میں تھے۔ ۱۹۱۹ء میں برطانیہ نے تجویز پیش کی کہ ایران کو عراق کے ساتھ ملا دینا چاہیئے کیونکہ دوسری جنگِ عظیم تک عراق برطانیہ کی سلطنت میں شامل تھا۔ مگر ایران نے ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا کہ وہ اپنی سلامتی کو داؤ پر نہیں لگائے گا۔ اس بعد پہلوی دَور کو دیکھ لیجیئے۔ مسائل موجود رہے۔ مگر انقلابِ ایران دنیا کی نظروں میں تنکے کی طرح کھٹکنے لگا اور یوں ماضی کے تمام معاہدوں؛ اصولوں اور ضابطوں کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے عراق نے ایران پر حملہ کیا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ایرانی قوم اس بار پھر سُرخرو ہو کر آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ اِس اجلاس سے انٹرنیشنل لاء کمیشن جنیوا کے پروفیسر احمد ماہیو اور ڈاکٹر ہادی ضافی نے بھی خطاب کیا۔ کانفرنس کی مختلف کمیٹیوں سے جن سکالروں نے خطاب کیا۔ ان میں ڈاکٹر کیتھ میکلاھان لندن یونیورسٹی، ڈاکٹر جیمز اونیل بریڈفورڈ یونیورسٹی، مسز الزبتھ بریڈفورڈ یونیورسٹی، ڈاکٹر فاروق حسنات احمد پاکستان، مسٹر پیٹر شولاتور مغربی جرمنی (یہ وہ صحافی تھے جو امام خمینی کے ساتھ ایران آئے تھے اور طیارے سے باہر نکلتے وقت امام خمینی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ یہ بون کے رہنے والے ہیں اور مغربی جرمنی کے ٹی وی کے سینئیر پروڈیوسر اور رپورٹر ہیں) بہمان بختیاری امریکی یونیورسٹی، انڈریو جے نیومین آکسفورڈ یونیورسٹی، ولیم ملورڈ کینیڈا، راجر گاروُدی فرانس اور ایران کی مختلف یونیورسٹیوں

اور اداروں کے دانشور بھی شامل تھے۔ پولیٹیکل اور ہسٹاریکل سٹڈیز کے ایک اجلاس میں پاکستان کے ڈاکٹر فاروق حسنات احمد کو وائس چیئرمین کی نشست پر بٹھایا گیا۔ ایرانی وزارتِ خارجہ نے سائرس ناصری نے ایک اہم نقطے پر اظہارِ خیال کیا۔ یہ نقطہ عراق میں شیعوں کے بارے میں تھا۔

انہوں نے بتایا کہ صدام حسین شروع ہی سے جنونی رہا ہے۔ عراق میں ۱۹۷۹ء میں اس نے سارے وزیروں کو اس لیے پھانسی دے دی تھی کہ اُن پر صدر صدام کے خلاف بغاوت کا الزام تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ عراق میں شیعوں کی آبادی ۵۵ فیصد سے بھی زیادہ ہے مگر وہ اقلیت کی طرح رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سلطنتِ عثمانیہ اور برطانوی راج ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کمیونسٹ، بعث، نیشنل اور اسلامی دھڑے تمام کے تمام شیعوں پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ بعث پارٹی کے ۹۰ فیصد ارکان شیعہ ہیں، عراقی فوج میں شیعوں کی تعداد ۹۰ فیصد سے زیادہ ہے۔ یہ سب کے سب عرب قبائل ہیں۔ شیعہ ہمیشہ ہی حکومتوں کے زیرِ عتاب رہے جب کہ دیگر نظریات کے لوگ نہ تو عثمانیوں کے زیرِ عتاب آئے اور نہ ہی برطانوی راج نے اُنہیں مشکلات میں مبتلا کیا۔ انہوں نے اپنے تجزیے میں بتایا کہ عراق میں اب کسی وقت بھی مارشل لا آسکتا ہے نیوی کی فوج وہاں بہت مضبُوط ہو گئی ہے۔ جاپانی مندوب کا ذوتا کا ہاشی نے جو جاپان کی ایئر یونیورسٹی میں اُستاد ہیں۔ اپنے مقالے میں کہا کہ امریکہ نے اپنا پُورا زور لگایا کہ کسی طرح جاپان، ایران کے ساتھ اپنے تعلقات ختم کر لے مگر اس کے باوجود کہ لوگ جاپان کو امریکہ کی کالونی سمجھتے ہیں ہم نے ایسا نہیں کیا۔ جاپان ایران سے اپنی ضروریات کا ۱۰ فیصد تیل درآمد کرتا ہے اور جاپان ایران اشتراک سے لگنے والا ایران پیٹرو کیمیکل پراجیکٹ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم ایران کے ساتھ کسی حد تک دوستی کے خواہاں ہیں۔ ملائیشیا کے مندوب نے کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کے بجائے دُعا کرائی۔ اُنہوں نے کہا کہ :

It is HEARTS GO BLIND NOT THE EYES GO BLIND

اُنہوں نے دُعا کی کہ ملتِ اسلامیہ کے وسیع تر مفاد کی خاطر تمام مسلمان ممالک اپنے اختلافات بھول جائیں اور متحد ہو کر اسلام دشمن قوتوں کا مقابلہ کریں۔ اُن کا لہجہ اتنا پُراثر تھا کہ سب نے اُن کے اس جذبے کی تعریف کی اور انہیں ایک عالمی فورم پر اس انداز سے اظہارِ درد کرنے پر مبارکباد دی۔ مختلف کمیٹی میٹنگوں میں دنیا بھر کے سکالر اہم مسائل پر گفتگو کر رہے تھے تقریریں جاری تھیں، سوالات ہو رہے تھے، ٹی وی اور اخبارات کے فوٹوگرافروں کے کیمرے اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ ایک خوبصورت سی گہما گہمی تھی۔ صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام اور پھر رات کو کہیں ڈنر کی دعوت وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا اور خاص طور پر جبکہ کانفرنس اختتام پذیر ہونے والی تھی۔ میرا دل روضۂ امام رضا علیہ السلام اور حضرت معصومہؑ کی زیارت کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ یہ وہی امامؑ ہیں جنہیں ہم اپنا ضامن مانتے تھے۔ جن کے نام کا امامؑ ضامن باندھ کر سفر کا، کاروبار کا غرض زندگی کے ہر نئے کام کا آغاز کرتے ہیں اور یہی وہ یقین ہے جو ہمیں کامیابی سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔ سید افضل حیدر اور ان کی بیٹیاں حضرتِ معصومہؑ کے مزار ۔ ہو کر آئیں تھیں۔ انہوں نے بہشتِ زہراؑ تہران کی زیارت بھی کر لی تھی اور میں ابھی تک ا اعزاز سے محروم تھا۔ میں انٹرنیشنل لاء کمیٹی کے اجلاس میں بیٹھا تھا کہ حسن بُوصراف آئے او یرے کان میں باہر آنے کو کہا۔ انہوں نے بتایا کہ ایرانی نیوز ایجنسی IRNA کے مینجنگ ڈ ریکٹر کمال خارازی کانفرنس صحافی مندوبین سے ملنے کے خواہاں ہیں۔ میں پہلے ہی حسن سے ہہ چکا تھا کہ اہم ایرانی شخصیات سے ملاقات ضرور کروانا ڈاکٹر کمال خارازی پی ایچ ڈی ہیں اور وار ہیڈ کوارٹر انفارمیشن سنٹر کے سربراہ بھی وہی تھے۔ اسی ہوٹل کے ۲۴ ویں فلور کے ایک سوئیٹ روم میں انہوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ترکی، الجیریا، مغربی جرمنی اور فرانس کے صحافی بھی وہاں موجود تھے۔ حسن برزوائی فرداً فرداً سب کو ڈھونڈ کر لائے تھے ڈاکٹر کمال نے ہماری پھل اور کافی سے تواضع کی۔ ایرانی بغیر دُودھ کے چائے تو پیتے ہی ہیں کافی بھی بلیک اور گاڑھی بغیر دُودھ کے ہی چلتی ہے۔ تاہم میں متوقع اختلاج قلب کے خوف

سے دُودھ کی آمیزش کافی میں ضرور کر لیتا تھا البتہ چائے بغیر دُودھ ہی کے مزہ دیتی تھی۔ ڈاکٹر کمال نے کہا کہ یہ محض ایک غیر رسمی سی ملاقات ہے اسے پریس کانفرنس نہ سمجھا جائے۔ تاہم ڈاکٹر کمال کی اس غیر رسمی گفتگو کو ہم لوگوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر کے پریس کانفرنس بنا ہی دیا۔ ڈاکٹر کمال کا خیال تھا کہ سلامتی کونسل کی قرارداد کو قبول کر کے ایران نے امن پسند دنیا کے دل جیت لیے ہیں مگر دشمن اتنا شاطر ہے کہ ایرانیوں کو اب پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔ ایک اور سوال کے جواب میں اُنھوں نے بتایا کہ ایران کے قبضے میں اس وقت تقریباً ۵۰ ہزار عراقی جنگی قیدی ہیں جب کہ عراق میں ایرانی جنگی قیدیوں کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہو گی۔ انھوں نے بتایا کہ عراقی ٹی وی پر بعض ایرانی سپاہیوں کی تصاویر دکھائی جاتی ہیں جو عراق میں کہیں نظر بند ہیں مگر ہمارے پاس اُن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں، عراقی اخبارات بھی بعض تصاویر شائع کرتے ہیں۔ عراقی فوج میں شیعہ سپاہیوں کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ عراق میں بعث پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ ہے اور ڈکٹیٹر شپ میں کسی کو اپنے عقائد اور خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت نہیں ہوتی اُنھیں وہی کرنا پڑتا ہے جو حکومت اُن سے کہتی ہے۔ میں نے پوچھا "کیا عراقی قیدی ایران میں سیاسی پناہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں"

ڈاکٹر کمال نے کہا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ تقریباً ۱۸۰۰ عراقی ایسے تھے جنھوں نے صرف اس لیے ہتھیار ڈالے کہ وہ یہاں سیاسی پناہ لینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر کمال نے بتایا کہ یہ جنگی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے کہ ۲۵ ہزار عراقی سپاہیوں نے ایک ہی وقت میں خرم شہر میں ہتھیار ڈالے اور خود کو ایرانی فوج کے حوالے کیا۔ میں نے ایک اور سوال پوچھا "ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے کہ عراق ایران جنگ بند ہو گئی ہے، ویت نام کا ڈرامہ بھی کب کا ختم ہو چکا، دنیا میں جو اتنا اسلحہ بن رہا ہے اور خاص طور پر امریکہ جو ہتھیار بناتا ہے وہ اب کہاں بیچے گا؟" میرے اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر کمال نے مسکراتے ہوئے کہا "سٹیج تو لگتے ہی رہتے ہیں، لوگ اپنے تحفظ کے لیے اسلحہ خریدتے ہیں۔ اُن پر اگر جارحیت کا ارتکاب کیا جائے تو انھیں

اپنا دفاع کرنا پڑتا ہے، ہو سکتا ہے امریکہ اگلا ڈرامہ آپ کے علاقے میں لگا لے" انہوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنا دفاع بخوبی کر لیا۔

ایک موقع پر دنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ شاید اب چند ہی گھنٹوں میں ایران فتح ہونے والا ہے۔ مگر آپ نے دیکھا کہ ہم نے خرم شہر سمیت اپنے تمام علاقے واپس لیے اور عراق کی تمام تر کوششوں کے باوجود اپنی جغرافیائی حدود کی کامیابی سے دفاع کیا۔ امریکہ کے ساتھ سفارتی تعلقات کی بحالی کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ اب اس بات کی کوئی اُمید نہیں رہی۔ امریکہ نے جس کھلم کھلا طریقے سے ہماری مخالفت کی ہے اور جس طرح جارح کا ساتھ دیا ہے۔ اب اس بات کا جواز باقی نہیں رہا کہ ہم امریکہ سے اپنے تعلقات بحال کر لیں۔ یہی وہ موقع تھا جب میں بھی امریکی مندوبین کے بارے میں استفسار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے پوچھا " ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ امریکہ آپ کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ مگر دوسری طرف آپ نے " دشمن " کے ۱۲ نمائندوں کو کانفرنس میں بُلا رکھا ہے۔ یہ دوغلی پالیسی نہیں ہے؟" ڈاکٹر کمال شاید اس سوال کے لیے تیار تھے فوراً بولے

" امریکہ سے سب سے زیادہ مندوب اس لیے بلائے ہیں کہ وہاں ریسرچ انسٹیٹیوٹ زیادہ ہیں، ہم نے تو روسیوں کو بھی دعوت دی تھی مگر وہ نہیں آئے اور پھر یہ ایک اکیڈمک کانفرنس ہے امریکیوں کا اس میں بُلایا جانا اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔" یہ ملاقات تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی۔ ڈاکٹر کمال کی شخصیت نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ کانفرنس کے دوران ہمیں رات کے کھانے کے دعوت نامے دیئے گئے۔ یہ کھانا ایران کے بینک ملی کی جانب سے تھا اور کلب کی عمارت میں اس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ عمارت وسطی تہران میں واقع ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا باغ ہے۔ ہم دعوت میں پہنچے تو ڈاکٹر کمال، ڈاکٹر شمس اور بینک ملی کے افسران نے ہمارا استقبال کیا۔ اس دعوت میں پہلی مرتبہ ایرانی خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اِن خواتین کا تعلق انسٹیٹیوٹ آف پولیٹیکل سٹڈیز سے تھا۔ یہاں بھی ایک بڑا سوئمنگ

پول موجود تھا جس کے اردگرد کرسیاں میز لگے تھے جن پر بھُنے ہوئے پستے کے پیالے پڑے تھے۔ نمکین پستے سے شغل کرتے ہوئے میں نے راجندر سرین سے بھارت میں اشیائے خوردونوش کی قیمتوں کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ وہاں بکرے کا گوشت ۱۴۲ روپے کلو ہے۔ اور مجھے یہ جان کر قطعاً حیرت نہیں ہوئی کہ راجندر سرین کا تعلق بھی گوشت خوروں میں ہے کیونکہ میں ایسے کئی پڑھے لکھے ہندوؤں کو جانتا ہوں جو اب اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ ایک صحت مند آدمی ساری زندگی سبزیوں اور دالوں پر گزارا کرتا رہے۔ وہ باقاعدہ گوشت خور ہیں اور مطلوبہ حرارے حاصل کرنے کے لیے جی بھر کر گوشت کھاتے ہیں۔ سرین نے بتایا کہ وہ گوشت کے لیے خود قصائی کے ہاں جاتے ہیں اور اپنی پسند کا گوشت کٹوا کر لاتے ہیں۔

یہاں بھی کھانا باغ میں لگا تھا۔ کھانے کا اہتمام دیکھ کر ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ یہ کینڈل ڈنر تھا، ہر میز پر موم بتی جلائی گئی تھی اور درختوں کو ہلکی ہلکی روشنیوں سے منوّر کر دیا تھا۔ میں، سیّد افضل حیدر، راجندر سرین، کرنل مہدی، آغا مرتضیٰ پویا اور ڈاکٹر حسنات فاروق ایک میز پر جا بیٹھے۔ چند تصاویر بنائیں اور کھانے سے خُوب لطف اندوز ہوئے۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کر لی تھی کہ کرنل مہدی بہت کم کھاتے ہیں۔ استفسار پر کہنے لگے ۷۰ برس کا ہوں کم کھاتا ہوں، خُوب گھومتا ہوں اور نتیجہ آپ خود دیکھ لیں۔ بات واقعی درست تھی، کرنل صاحب ۵۰/۴۵ سے زیادہ کے کسی طرح بھی نہیں لگتے، چہرے پر ماشاءاللہ اس عمر میں بھی سُرخیاں ہیں۔ قابلِ رشک صحت ہے۔ اُنہیں دیکھ کر اور اپنی عادات کا اُن سے موازنہ کرنے کے بعد میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اوّل تو ساٹھ کا ہندسہ پار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو یہ دم خم نہیں ہوں گے۔ کھانے میں سب سے مزیدار چیز پلاؤ تھا۔ کھانے کی میز پر اب جو سیاسی گفتگو چل رہی تھی۔ اس کا محور اپنا پاکستان تھا، آغا پویا سے کچھ سوالات "دی مسلم" کے بارے میں ہوئے، مشاہد حسین کے جانے اور ملیحہ لودھی کے آنے کا تذکرہ بھی ہوا۔ آغا پویا نے بتایا کہ آج سے ملیحہ لودھی کا نام پرنٹ لائن میں شائع ہونا

شروع ہو گیا ہے۔ کھانا بے حد اچھا تھا۔ خوب جی بھر کر کھایا اور اتنا کھایا کہ ہوٹل واپس آکر حفظِ ماتقدم کے تحت اپنی کِٹ میں رکھا ہوا چُورن پھانکنا پڑا۔ کھانا ختم ہوا تو تصاویر بنانے کا سلسلہ شروع ہوا، یہ ایک یادگار لمحہ تھا جسے ایرانی اور مہمان مندوب بھی ریکارڈ کے طور پر عکس بند کر لینا چاہتے تھے۔ مہمان رُخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر کمال صاحب کو مسکرا مسکرا کر خدا حافظ کہہ رہے تھے، سیّد افضل حیدر کو شاید اس سے قبل اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ انہوں نے بھی امریکیوں کو مدعو کرنے پر ڈاکٹر کمال سے شکوہ کر ڈالا اور ساتھ ہی یہ شکایت بھی کی کہ پاکستانی وفد کے ساتھ آپ لوگوں نے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ یہ سیّد صاحب کی اپنی رائے تھی جس کے ساتھ ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں تھا۔ آج پھر ایران ٹی وی نے کانفرنس کو بھرپور کوریج دی تھی اور میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ امریکی مندوب کے لیکچر پر جو سوال میں نے بھری برداری میں کہا تھا اس کی رپورٹنگ من وعن کی گئی

آج کانفرنس کا آخری روز تھا۔ تینوں کمیٹیوں کے اجلاسوں کی سمری آخری اجلاس میں پیش کی جانے والی تھی اور میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ ایران کی اسلامی اسمبلی کے سپیکر اور افواج کے قائم مقام کمانڈر انچیف سید علی اکبر ہاشمی رفسنجانی آج کی تقریب میں مہمانِ خصوصی تھے۔ میں اس ایرانی رہنما کی بہادری، دلیری اور گفتگو کے انداز کے بارے میں بہت کچھ سُن چکا تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ امام خمینی کے بعد ایران کے سیاسی اُفق پر سب سے اہم ستارہ یہی سیّد زادہ ہے اور اب میں اس وقت کا شدّت سے انتظار کر رہا تھا جب علی اکبر ہاشمی کی باتیں سننے کا موقع ملے۔

اجلاس شروع ہوا تو سب سے پہلے اسلامی کمیٹی کی رپورٹ پیش کی گئی۔ اس رپورٹ میں کمیٹی کے اجلاسوں میں پڑھے گئے مختلف مقالات اور اُن پر اُٹھائے گئے سوالات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی کا سب سے اہم نقطہ جہاد کا سیاسی تصوّر تھا، پھر دنیا بھر میں مختلف مذاہب کے آپس میں ٹکراؤ اور اقتدار کی خاطر بعض قوتوں کے مذہب کو استعمال کرنے کے بارے میں بھی خاص نقاط پر سیر حاصل گفتگو اس سمری میں شامل تھی۔ رپورٹ میں خدا کے قانون کے نفاذ کی

راہ میں حائل رکاوٹوں کا بھی تفصیلی تذکرہ ہوا اور ان کے خاتمے کے لیے مختلف ذرائع تجویز کیے گئے۔ رپورٹ میں جنگی قیدیوں کے حقوق اور اُن کے ساتھ سلوک کا بھی ذکر کیا گیا۔ دوسری رپورٹ انٹرنیشنل کمیٹی کی تھی۔ کینیڈا کے مندوب میرے بائیں ہاتھ بیٹھے تھے اور ہم بار بار پانی کا مزا چکھ رہے تھے۔ کمیٹی کے چیئرمین اپنی رپورٹ فارسی میں پیش کر رہے تھے اور اس کا ساتھ ہی ساتھ ترجمہ ہم لوگ سُن رہے تھے۔ ایک موقع پر کینیڈا کے مندوب نے ایک کاغذ پر لکھ کر بھیجا

IT IS NOT A REPORT

IT'S A PAPER AGAIN

وہ شاید رپورٹ کی طوالت سے گھبرا گئے تھے۔ رپورٹ میں وضاحت کی گئی کہ عراقی حکومت عباسیوں کی وارث ہے جو میکاولی کے فلسفۂ سیاست پر یقین رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں جب عراق میں بعث پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو اُنھوں نے وہی مظالم دھرائے جو عباسیوں کا خاصا رہے تھے۔ اس رپورٹ میں بڑی تفصیل سے موضوع کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے یہ بڑی طویل بھی ہو گئی تھی۔ کینیڈا کے مندوب اپنی بوریت دُور کرنے کے لیے گاہے میرے ساتھ رقعہ بازی کر رہے تھے۔ پولیٹیکل اینڈ ہسٹاریکل کمیٹی کی رپورٹ ڈاکٹر کمال نے خود پیش کی جو اس کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ انھوں نے اس اجتماع کو انتہائی اکیڈمیک، متوازن اور دانشورانہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ کانفرنس کا معیار انتہائی اطمینان بخش تھا۔ اب وہ لمحات قریب تھے جب علی اکبر ہاشمی آنے والے تھے۔ اچانک ہال میں ایک ہلچل سی محسوس ہوئی۔ رفسنجانی کی آمد کا اندازہ یوں تھا جیسے کوئی جنگجو آخری معرکہ سر کرنے میدانِ جنگ میں داخل ہوتا ہے۔ میں رفسنجانی کے لیے کوئی دوسری تشبیہ ڈھونڈ رہا تھا اور کوشش کے باوجود میرے ذہن میں اس سیدزادے کے لیے "چیتے" کے علاوہ اور کوئی تشبیہ نہیں آئی۔ چاک و چوبند اور ہوشیار وہ سادہ سا جبّہ پہنے سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ اُن کی دھیمی سی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ اس اجتماع میں آکر بے حد خوش ہیں۔ درُود کے بعد سید علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے

ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کانفرنس میں پڑھے گئے مقالے اور بحثیں یقینی طور پر عالمی تعلقات کے لیے ایک مضبوط بنیاد ثابت ہوگی اور ان کی روشنی میں عالمی مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔ اُنہوں نے کہا کہ میں نے جو رپورٹیں سُنی ہیں اُن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف مسائل پر تفصیلی بحث ہوئی ہے۔ ان تمام باتوں کو سُننے کے بعد جو خاص بات میرے ذہن میں پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے انقلاب کے بعد اور خاص طور پر ۸ برس کی جنگ میں بہت سے سبق سیکھے ہیں جو اب تاریخ کا اثاثہ بن گئے ہیں۔ تجزیہ نگاروں مفکروں اور دانشوروں کو ان تجربات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور حقائق کو غور سے دیکھنا چاہیئے۔ آپ اسے انسانی تعلقات کی تجربہ گاہ قرار دے سکتے ہیں کیونکہ جو کچھ یہاں سے سیکھا جا سکتا ہے وہ اور کہیں سے نہیں سیکھا جا سکتا۔ بظاہر یہ جنگ جو دو ملکوں کے درمیان ہوئی، ہم اس جنگ کے لیے تیار نہ تھے، ایک طرف انقلاب تھا اور دوسری طرف عالمی طاقتوں کے گماشتے تھے۔

یہ لوگ ایران کے انقلاب کو سبوتاژ کرنا چاہتے تھے، اسرائیل بھی ہمارے دشمنوں میں شامل ہے، اسلحے کی ایک دوڑ لگی ہوئی تھی۔ عراق نیٹو اور امریکہ پر بھروسہ کر رہا تھا مگر ہمارے پاس نہ تو اتنا اسلحہ تھا اور نہ ہی اتنی فوجی قوت تھی۔ خاص طور پر انقلاب کے بعد ایران کی فوج کے پاس وہ تجربہ نہ تھا جو ایک پروفیشنل آرمی کے پاس ہوتا ہے، اب ہمارے پاس امریکی جنگی ماہرین بھی نہ تھے اور ان قوتوں کے مقابلے میں فوجی لیڈرشپ بھی نہ تھی۔ جو تھوڑی بہت قوت تھی وہ بھی انقلاب دشمن قوتوں کی سرکوبی کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ ہمارے اہم اور فوجی حکمت عملی کے ماہر لوگ ملک چھوڑ گئے تھے۔ اب ہمارے پاس صرف چھوٹے رینک کے فوجی تھے جن کی کومٹمنٹ کو کہیں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہمارے وہ پاسدار تھے جنہیں گھر میں انقلاب دشمن قوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا۔ مشرق اور مغرب کی قوتیں عراق کی حمایت کر رہی تھیں۔ ایسی صورتحال تو دنیا کی دو بڑی جنگوں میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ جنگوں میں بھی دو بڑے اتحادی گروپ آمنے سامنے تھے مگر یہاں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ ہم اکیلے تھے اور ہمارے خلاف دنیا کی بڑی طاقتیں

عراق کے شانہ بشانہ کھڑی تھیں۔ اقوامِ متحدہ کے کانوں پر بھی جُوں تک نہیں رینگی، یہ حملہ ہمارے لیے بڑے شاک کا باعث ہو سکتا تھا۔ دراصل یہ سب لوگ بڑے پُر امید تھے کہ اب کچھ ہی دنوں میں انقلابِ ایران کو ختم کر دیا جائے گا۔ دُور نہ جائیے ہمارے ساتھی ممالک جن کے پانیوں کے ساتھ ہمارے پانی اور جن کی زمینوں کے ساتھ ہماری زمینیں ملتی ہیں خوش تھے، ہمیں برباد دیکھ کر مسکرانا چاہتے تھے اور یہ سب تاریخ کا حصّہ بن چکا ہے۔ ان کی یہ خواہشیں جو کبھی پوری نہ ہو سکیں۔ آج تاریخ کے اوراق پر رقم ہو چکی ہیں۔ آپ نے تاریخ میں اس سے پہلے کوئی واقعہ دیکھا ہے کہ ایک ملک بغیر کسی بیرونی امداد کے انقلاب سے بھی کامیابی سے دوچار ہوا ہو اور اتنی بڑی اور طویل جنگ بھی اس نے ایک ساتھ کامیابی سے لڑی ہو۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ ایسے حالات پیدا کرنے میں عالمی لیڈر شپ کی بدنیتی کا بڑا ہاتھ ہے۔ عالمی سطح پر قابل لیڈر شپ کی کمی ہے۔ سیاست، اقتصادیات اور ثقافت کے میدان میں اگر لیڈر شپ نیک نیت ہو گی تو امن اور انصاف قائم ہو سکتا ہے مگر جو لوگ حکومت کر رہے ہیں اور جن کے پاس طاقت ہے اس مسئلے کو نہیں سمجھتے، وہ نیک نیت نہیں ہیں، وہ امن قائم ہی نہیں کرنا چاہتے۔ قانون ہمیشہ فائدے کے لیے بنایا جاتا ہے مگر ہمیں آج تک عالمی قانون اور قاعدے کے بہتر ہونے کا انتظار ہے، آج طاقت اُن کے ہاتھ میں ہے جو انصاف پسند نہیں ہیں۔ اگر وہ انصاف پسند ہوتے تو شاید آج سے زیادہ طاقتور ہوتے۔ جب کسی پر جنگ مسلط کر دی جائے تو عالمی قانون مظلوم کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنا دفاع کرے۔ ہمارا انقلاب اسلامی انقلاب ہے۔ اس انقلاب کا مقصد وہی ہے جو محمدؐ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا تھا اور وہ تھا دنیا میں انصاف قائم کرنا۔ مَیں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم صرف دفاع کے لیے لڑے ہیں، ہماری جنگ اصولوں کی جنگ تھی۔ ہماری فضائی فوج کو شروع ہی سے عراق کی فضائی فوج پر برتری حاصل تھی۔ ہم چاہتے تو روزِ اوّل ہی سے عراق کی سپلائی ختم کر سکتے تھے۔ ہمارے ایک پائلٹ نے بتایا کہ وہ ایک مشن پر تھا مگر جب وہ اس پل پر پہنچا جسے اُڑانے کے لیے وہ آیا تھا تو اس پر ایک سویلین

کار جا رہی تھی۔ پائلٹ نے بتایا کہ اس نے سویلین کار کے پُل سے گزر جانے کا انتظار کیا اور جب کار گزر گئی تو پھر پُل کو نشانہ بنایا۔ حالانکہ یہ جنگ کے مروجہ اصولوں کے خلاف بات ہے کار گزرنے کے انتظار میں اس کا اپنا جہاز نشانہ بن سکتا تھا، اس کی اپنی موت واقع ہو سکتی تھی مگر اس نے ثابت کیا کہ اصول وہی ہوتا ہے جس میں انسانوں کی بھلائی ہو۔

عراقیوں نے ۱۰۰ ایل کے علاقے سے گھروں سے معصوم شہریوں کو گرفتار کر کے جنگی قیدی بنایا۔ وہ آج بھی عراقی کیمپوں میں ہیں جب کہ ہمارے پاس عراق کا ایک بھی سویلین نہیں ہے ہم نے ہمیشہ مفتوح علاقے میں لوگوں سے یہ کہا کہ وہ عراق جانا چاہئیں تو جا سکتے ہیں اور اگر ہمارے ساتھ رہنا چاہیں تو ہم اُنہیں خوش آمدید کہیں گے۔ عراق نے خود اپنے شہریوں پر کیمیائی ہتھیار پھینکے، جس کے ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں اور دنیا بھر کے صحافیوں نے یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ دشمن کے لیے ہر بات آسان ہوتی ہے، برباد کرنا کیا مشکل بات ہے مگر ہم نے یہ فلسفہ، یہ اصول اپنے امام اوّل حضرت علی علیہ السلام سے سیکھا ہے لوگ حضرت علیؑ سے کہتے تھے کہ آپ بھی معاویہ کی طرح سیاسی ہتھکنڈے استعمال کریں مگر امامؑ فرماتے تھے کہ لوگو! یہ بات نہیں ہے کہ میں سیاست نہیں جانتا، خدا کی قسم میں معاویہ سے بہتر سیاست جانتا ہوں مگر یہ اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے، میرے رسولؐ نے مجھے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے اور میں اگر ان اصولوں پر پابند نہ ہوتا تو ایسی سیاسی چالیں بناتا کہ معاویہ پریشان ہو جاتا۔ رفسنجانی نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہی وہ اصول ہیں جن پر چل کر ہم نے حق کی راہ پائی ہے، ہم انہی راستوں پر چلنا چاہتے ہیں اور یہی ہماری فتح ہے اور خدا ہمیشہ اصولوں پر چلنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم اپنی قیادت اور عوام کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کریں گے۔ یہ اصول اب تاریخ میں لکھے جا چکے ہیں۔ اب لوگ یہ باتیں تاریخ کی کتابوں میں پڑھیں گے اور مجھے یقین ہے کہ تاریخ آنے والی نسلوں کے لیے اچھے سبق اکٹھے کر رہی ہے۔ لوگ ایران کے انقلاب کے بارے میں متضاد باتیں کرتے ہیں۔ مجھے کہنے

دیکھیئے کہ ہمارا انقلاب ابھی نوجوان ہے۔ ہمارے ہاں بھی دائیں اور بائیں بازو کے گروپ تھے۔ اندرونی طور پر بہت سے جھگڑے تھے، فوجی ٹھکانے بائیں بازو کے ہاتھ میں تھے۔ ہر روز دھماکے ہوتے، جھگڑے ہوتے، مگر ہم مطمئن ہیں کہ ہم نے انقلاب کے ذریعے جو چاہا وہ پالیا۔ مخالف پراپیگنڈہ شاید ہی کسی کے خلاف کبھی اتنا ہوا ہو جتنا انقلاب ایران اور ایران کی قیادت کے خلاف ہوا۔

مشرق اور مغرب میں کسی کو بھی یہ انقلاب ایک آنکھ نہیں بھایا۔ مغرب والے اسے اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے جبکہ مشرق والے اسے صرف ایک سکول آف تھاٹ یعنی شیعوں کا انقلاب سمجھتے تھے۔ جو مارکسزم سے متاثر تھے انہیں جلد ہی پتہ چل گیا کہ اس سرزمین پر مارکسزم نہیں چل سکتا، چنانچہ اسلامی ممالک میں مارکسیوں کو سخت دھچکا لگا اور یہ دھچکا انہیں سرمایہ داروں نے نہیں بلکہ مسلم نوجوانوں نے پہنچایا تھا، جن کا ایمان ہے کہ انصاف قرآن سے مل سکتا ہے۔ ہمارے قوّت والے دشمنوں نے اس ضمن میں عراق کی بعث پارٹی کو منتخب کیا۔ عراق کے عوام بھی اپنے ملک میں اسلامی انقلاب کے خواہاں تھے اور یہ انقلاب وہاں آرہا تھا مگر اس انقلاب کو روکنے کے لیے انہوں نے ہم پر جارحیت کروائی تاکہ ایران میں ایسی حالت پیدا کی جائے کہ لوگ کہیں کہ ہم انقلاب کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ ایران میں ایسے حالات پیدا کرنے کی ذمہ داری استعماری قوتوں نے عراق کو دے دی۔ ہم نے عالمی اداروں کو بھی بتایا کہ ایران میں ۹۹ فیصد لوگوں نے انقلاب کے حق میں ووٹ دیئے ہیں اور جمہوریت پسند جانتے ہیں کہ یہاں بہترین جمہوریت موجود ہے۔ آپ خود بتائیں کہ کسی ملک میں ۸۵، ۹۰ یا ۹۹ فیصد اکثریت سے لیڈر شپ منتخب کی جاتی ہے۔ ۱۰ سال کی سخت ترین مشکلات کے بعد آپ نے دیکھا ہو گا کہ لوگ کہتے ہیں کہ عوام اور امام خمینی میں فاصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ مگر یوم غدیر پر لوگ سڑکوں اور گلیوں میں انقلاب کی حمایت میں نکل آئے تھے۔ امام جمہوریت کی اساس ہیں۔ لوگوں نے سچّی قیادت کی حمایت کی ہے مگر ہمارے دشمنوں کو اسلام کے بعض

اور بڑی طاقتوں نے اندھا کر دیا ہے۔ پہلے ۲/۱ سال تو ہمیں اپنی فوجی قوت اکٹھا کرنے میں لگے، پھر ہم نے جوابی حملہ کیا۔ دو تین آپریشنوں کے بعد خرم شہر واپس لے لیا گیا۔ آپ خود فیصلہ کیجئے تاریخ کے اس موڑ پر ایسی کوئی اور مثال ہے؟ مگر اس کے باوجود ہم نے اپنی کارروائیوں کو اپنے دفاع تک محدود رکھا، عراق کو آہستہ آہستہ احساس ہو گیا کہ ہم دفاع کر رہے ہیں تو اس نے عالمی ضابطوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ ہم نے آغاز ہی میں کہہ دیا تھا کہ ہمارا مقصد علاقے حاصل کرنا نہیں ہے۔ ہم صرف اپنا دفاع کر رہے تھے اور حملہ آور کو سزا دینا چاہتے تھے، ہم نے سلامتی کونسل کی قرارداد کو صرف اس لیے قبول کیا ہے کہ یہ جارح کی نشاندہی کرے گی۔ اگر سات سال پہلے یہ کمیٹی قائم ہو جاتی تو ہم یہ قرارداد سات سال پہلے قبول کر لیتے جب ہمیں جارح پر مکمل برتری حاصل تھی مگر ہم نے پھر بھی کوئی کام خلافِ اصول نہیں کیا۔ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔ یہ اُن لوگوں کے لیے مثال ہے جو عالمی امن کے دشمن ہیں۔ پھر ہمارے خلاف کیمیائی ہتھیار استعمال کیے گئے۔ ہمارے لیے بھی کیمیائی ہتھیار بنانا مشکل نہیں تھا۔ ہمارے پاس بھی یہ مہارت موجود ہے۔ ہمارے پاس میزائل بنانے کی صلاحیت بھی ہے اگر ہمارے ارادے بھی ایسے ہوتے تو ہم بھی کثرت سے کیمیائی ہتھیار اور میزائل استعمال کرتے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اب یہ دنیا کے ضمیر کا کام ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے ایران عراق جنگ میں جارح کون ہے۔ عراق نے شروع ہی سے شہری آبادیوں پر حملے کیے۔

بصرہ کا شہر جس کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔ ہماری مارٹر توپوں کی زد میں تھا۔

بغداد وہاں سے صرف ۱۰ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم نے ابادان اور خرم شہر خالی کروا لیے تھے اور کئی دوسرے سرحدی شہر ہماری توپوں کی زد میں تھے مگر ہم نے شہری آبادیوں پر حملہ اصولوں کے خلاف سمجھا، ہم نے اصولوں کی پاسداری کی۔ اُنہوں نے خود اپنے سپاہیوں کو کیمیائی ہتھیاروں سے زخمی کر کے یو این او کی ٹیموں کو بیوقوف بنانے کی کوشش کی خلیج

فارس میں ایک ہزار کلومیٹر تک۔ ہمیں تیل کے جہاز دکھائی دے رہے تھے، جو کویت، عراق اور سعودی عرب کا تیل اور دیگر سازوسامان لاتے لے جاتے تھے۔ ہمارے بحری بیڑے کا اس علاقے پر مکمل کنٹرول تھا۔ مگر ہم نے خلیج کا امن قائم رکھا۔ اِن جہازوں پر امریکی جھنڈے لگنے سے پہلے صرف ایک جہاز کو نشانہ بنایا گیا۔ مگر نہ جانے اس وقت امریکی قوم کا ضمیر کہاں سو گیا جب امریکہ خلیج میں آیا اور ہمارا کھُلم کھُلا حریف بن گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ امریکی قوم اس کا ریکارڈ رکھے گی یا نہیں کہ امریکہ نے فرنگیوں اور ہٹلر کا زمانہ یاد دلا دیا۔ یو این او کو غریب قومیں بھی پیسہ دیتی ہیں مگر کسی نے امریکہ سے نہیں پوچھا جو سارے عالمی ضابطے توڑنے کے باوجود بھی خود کو CIVILISED کہتا ہے۔ یہ کتنا بڑا اور سنگین جرم ہے کہ امریکی بیڑے نے معمول کی پرواز پر جانے والے ہمارے ایک مسافر طیّارے کو فضا میں نشانہ بنایا۔ اتنا بڑا جرم کرنے کے باوجود انہوں نے کہا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ غلطی نہیں ہے، ان کا مفاد جہاں زد میں آئے گا۔ یہ کسی بھی ظلم سے گریز نہیں کریں گے

۲۹۰ معصوم لوگوں کی جان لے کر بھی یہ لوگ کس طرح مطمئن ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ یہ جنگ ایک تجربہ گاہ ہے۔ آپ اپنی حکومتوں سے یہ سوال ضرور کریں کہ امریکہ کو سعودی عرب کیوں پیارا ہے۔ کیا وہاں پارلیمنٹ ہے۔ کیا وہاں کبھی انتخابات ہوئے ہیں؟ اُسے تو آپ اپنا دوسرا گھر سمجھتے ہیں مگر جہاں میزائلوں کی بارش میں لوگوں نے ووٹ ڈالے اسے آپ جمہوری نہیں سمجھتے۔ عراق میں کونسی جمہوریت ہے۔ اُنہوں نے کُردوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ میں امریکہ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخ میں اَب تمہارا چہرہ سیاہ ہو چکا ہے۔ تم یہ سب تیل حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہو اور کچھ سلاطین تمہارا ساتھ بھی دے رہے ہیں مگر یاد رکھو کہ یہ بڑی طاقتوں کے لیے ایک بُری تجربہ گاہ ہے۔ ذرا تفاوت ملاحظہ کیجیئے:

عراق کا ۷۰ فیصد اسلحہ روس سے آتا ہے اور اس کے غم میں امریکہ الگ پاگل ہوا جا رہا ہے،

زندہ رُود کے قہوہ خانے میں امریکیوں کی حقہ نوشی

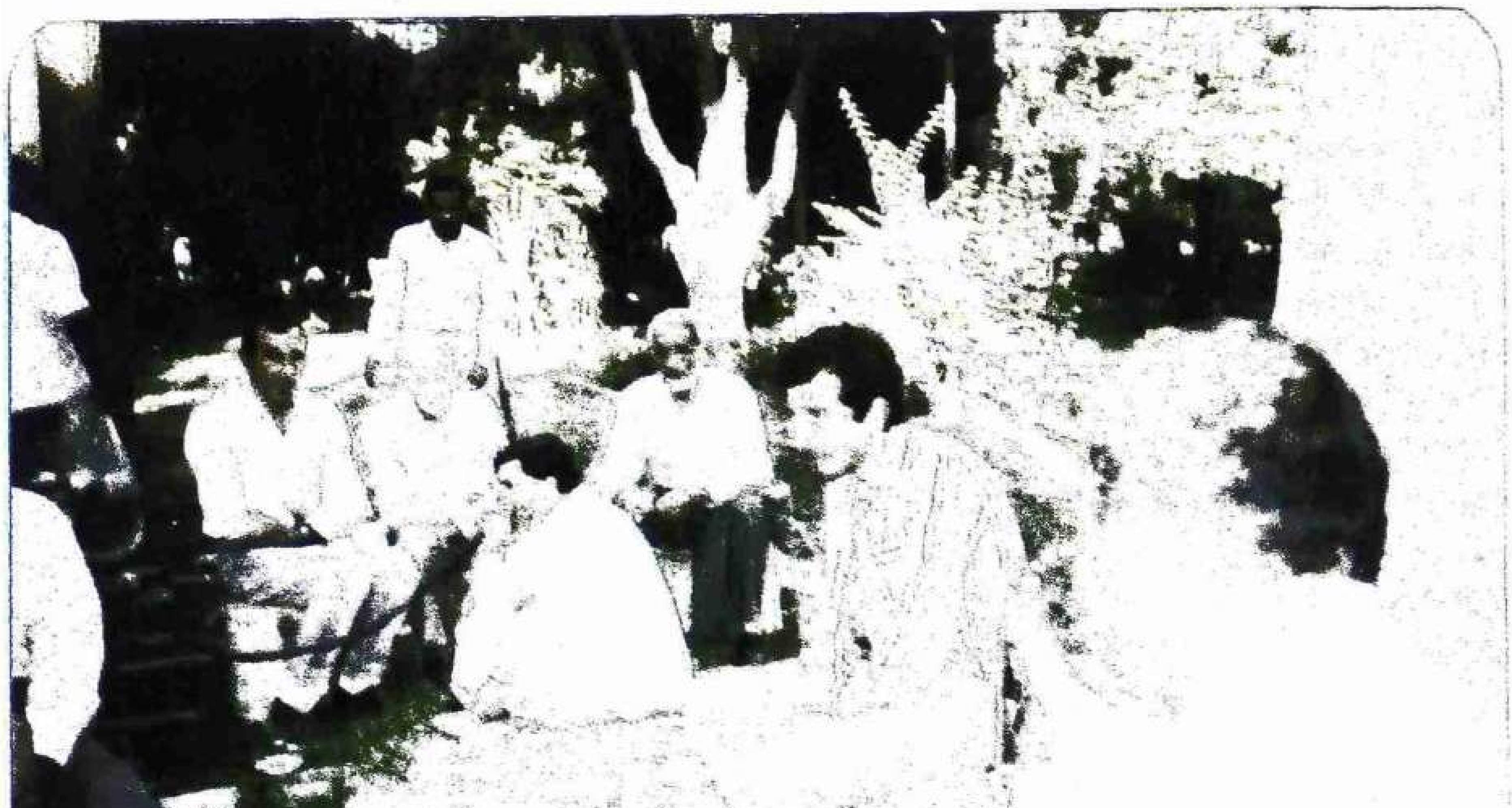

محل چہل ستون میں ایرانی بزرگوں کے ساتھ حقہ نوشی

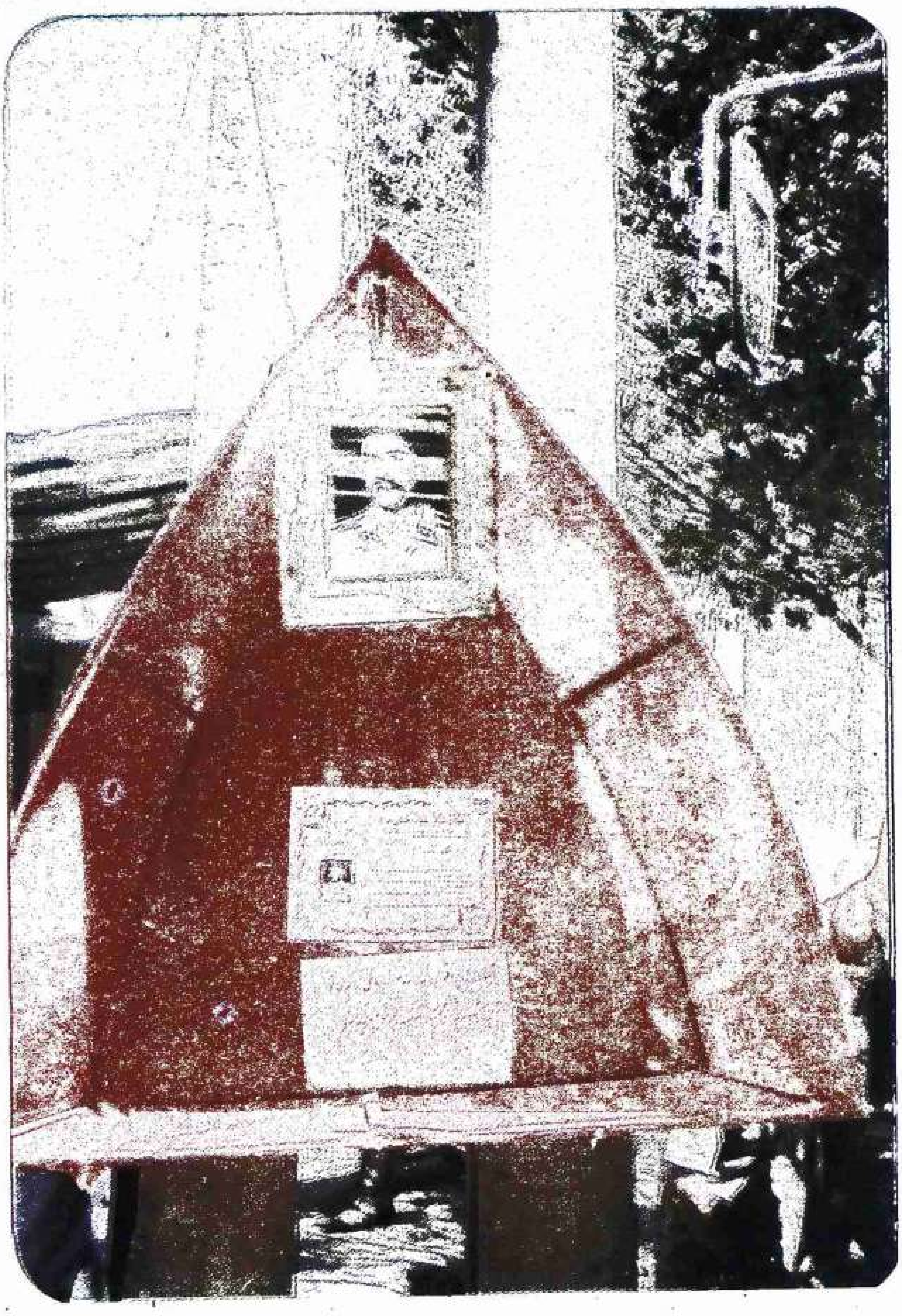

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

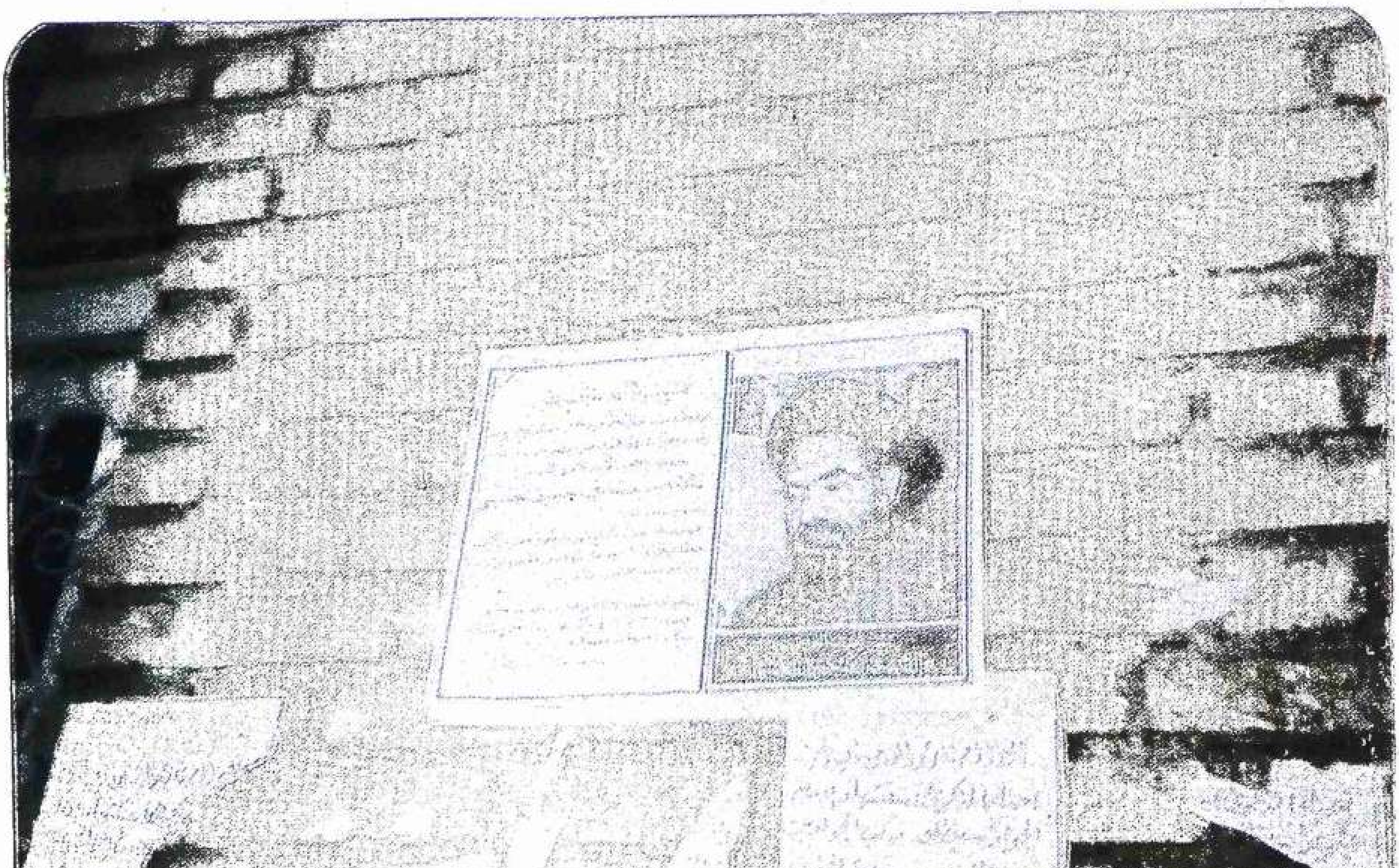

قسم کی دیوار پر علامہ حسینی کی شہادت کے بارے میں بورڈ

محل چہل ستون کے قہوہ خانے میں

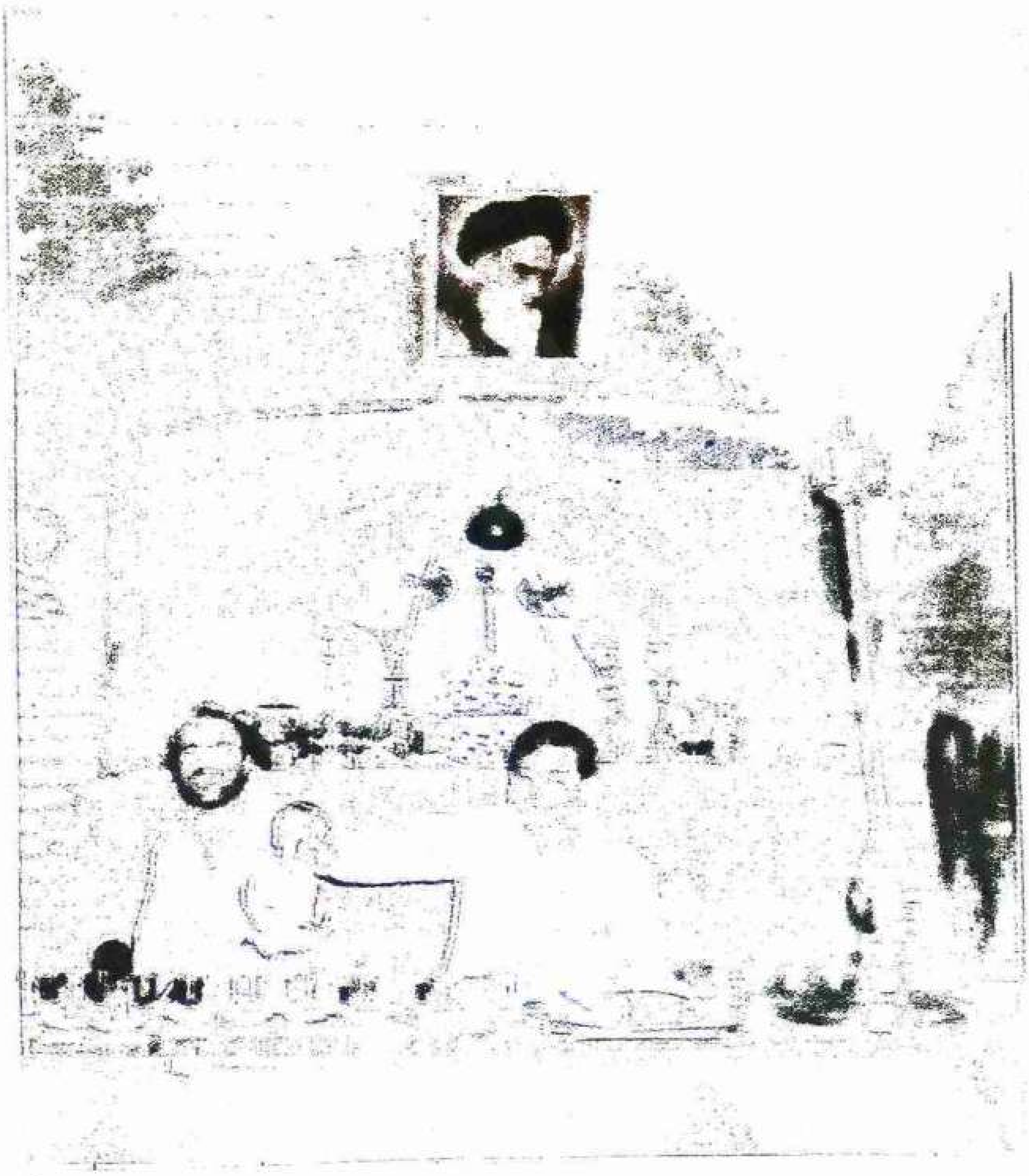

مشہد کے ہوٹل کے ویٹر کے ساتھ

امام رضاؒ کے روضے کے باہر

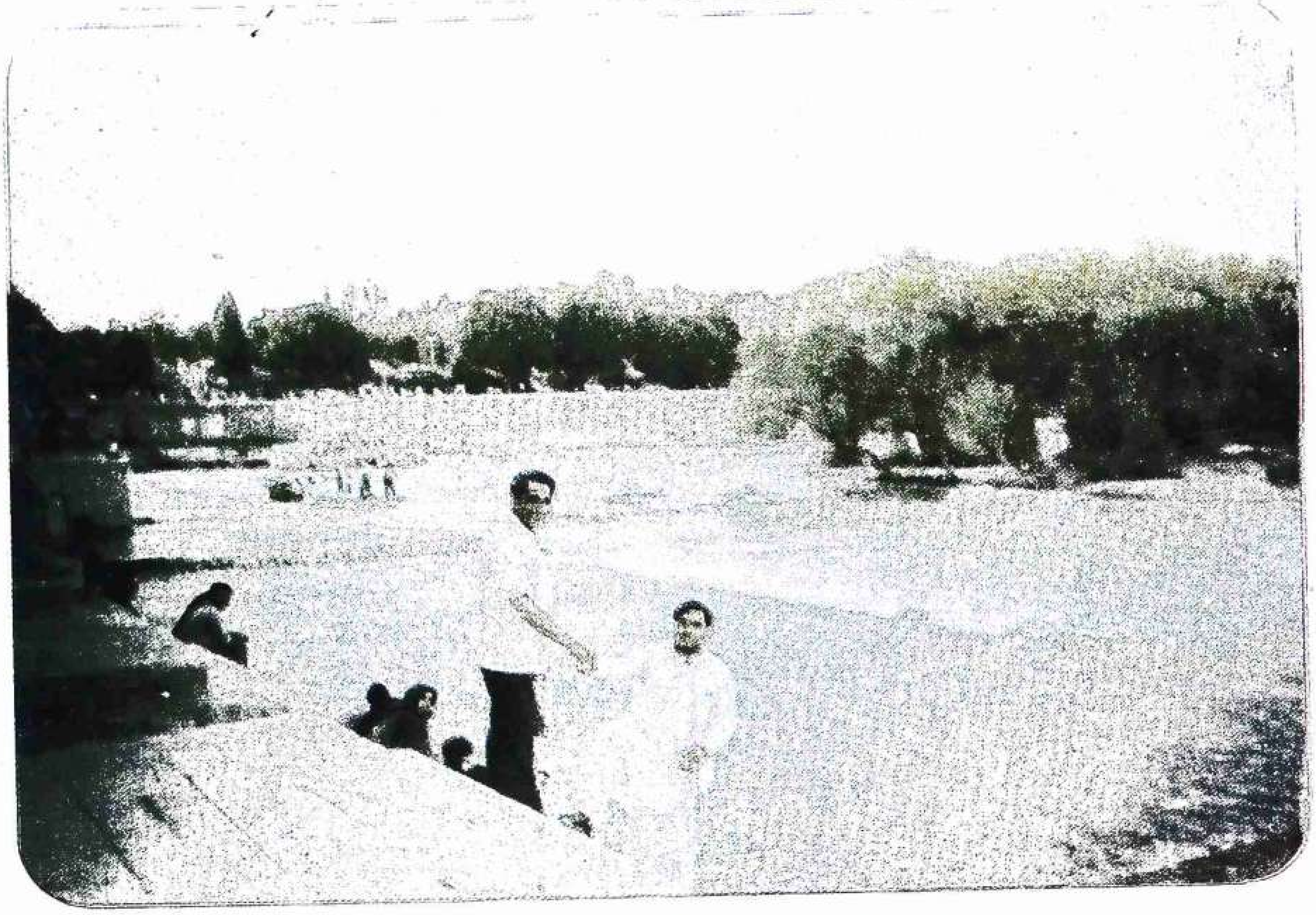

زندہ رُود پر سیّد افضل حیدر کے ساتھ

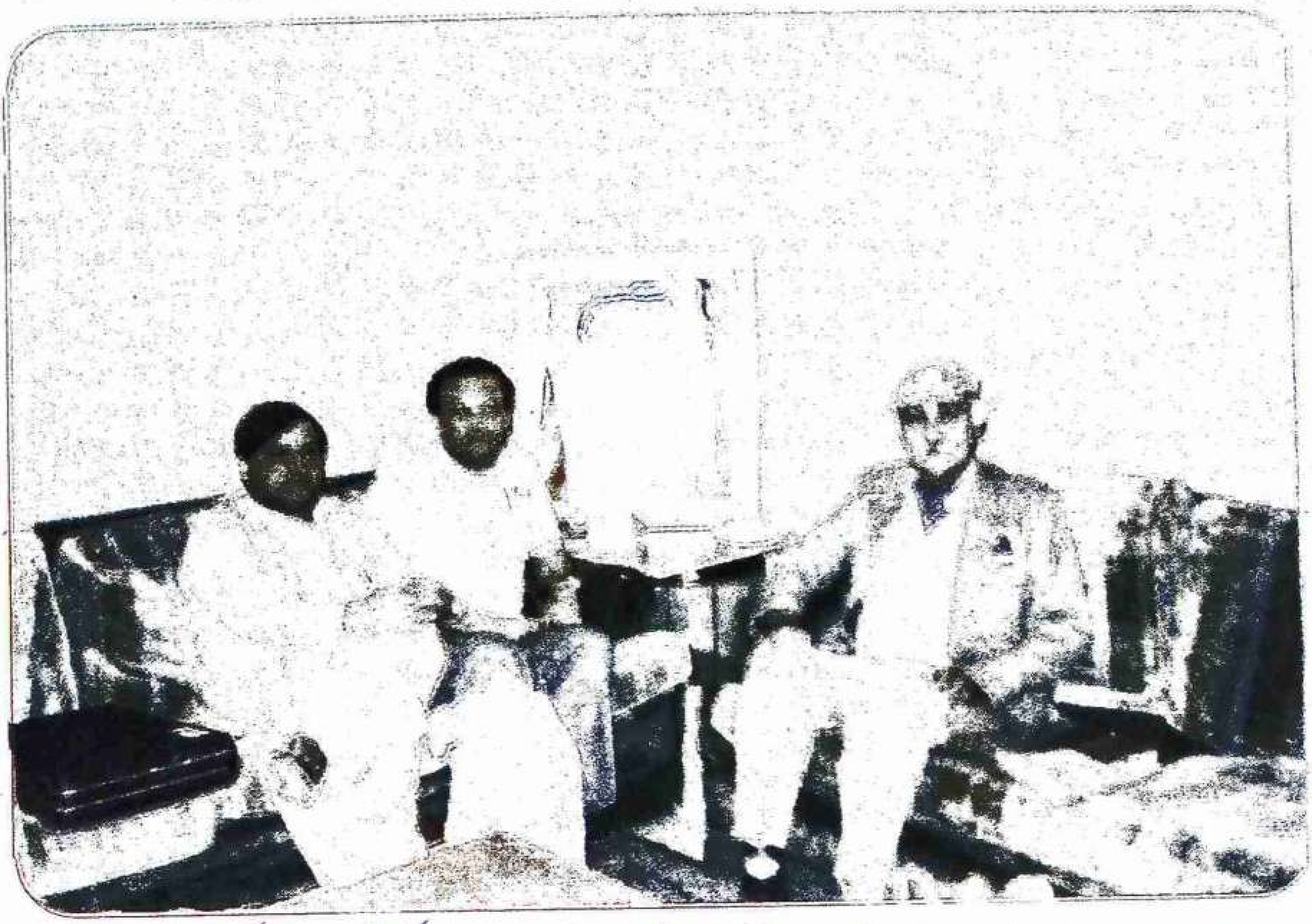

تہران ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں ڈاکٹر حسنات احمد اور کرنل مہدی کے ساتھ

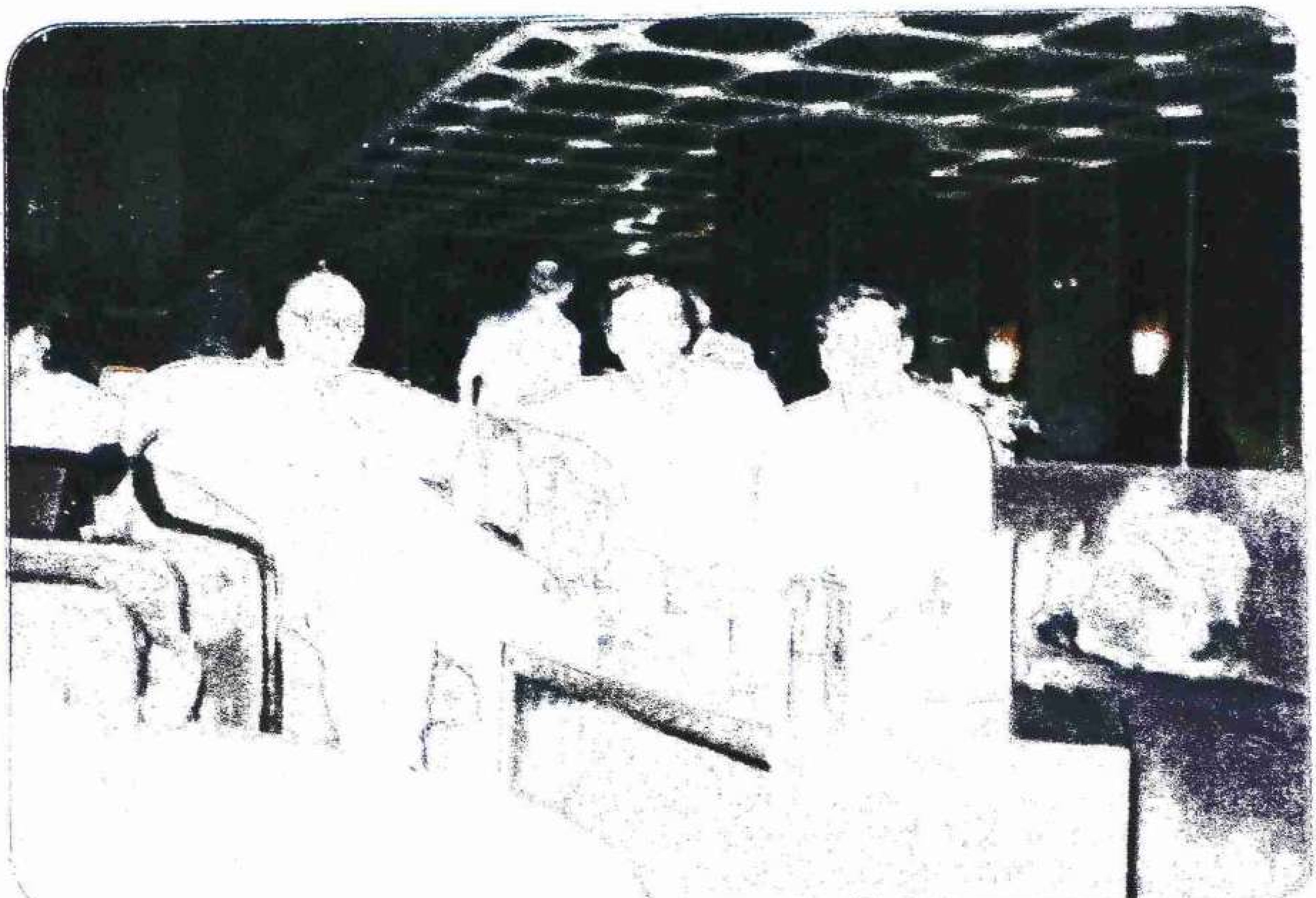

ہوٹل کی لابی میں ڈاکٹر حسنات اور راجندر سرین کے ہمراہ

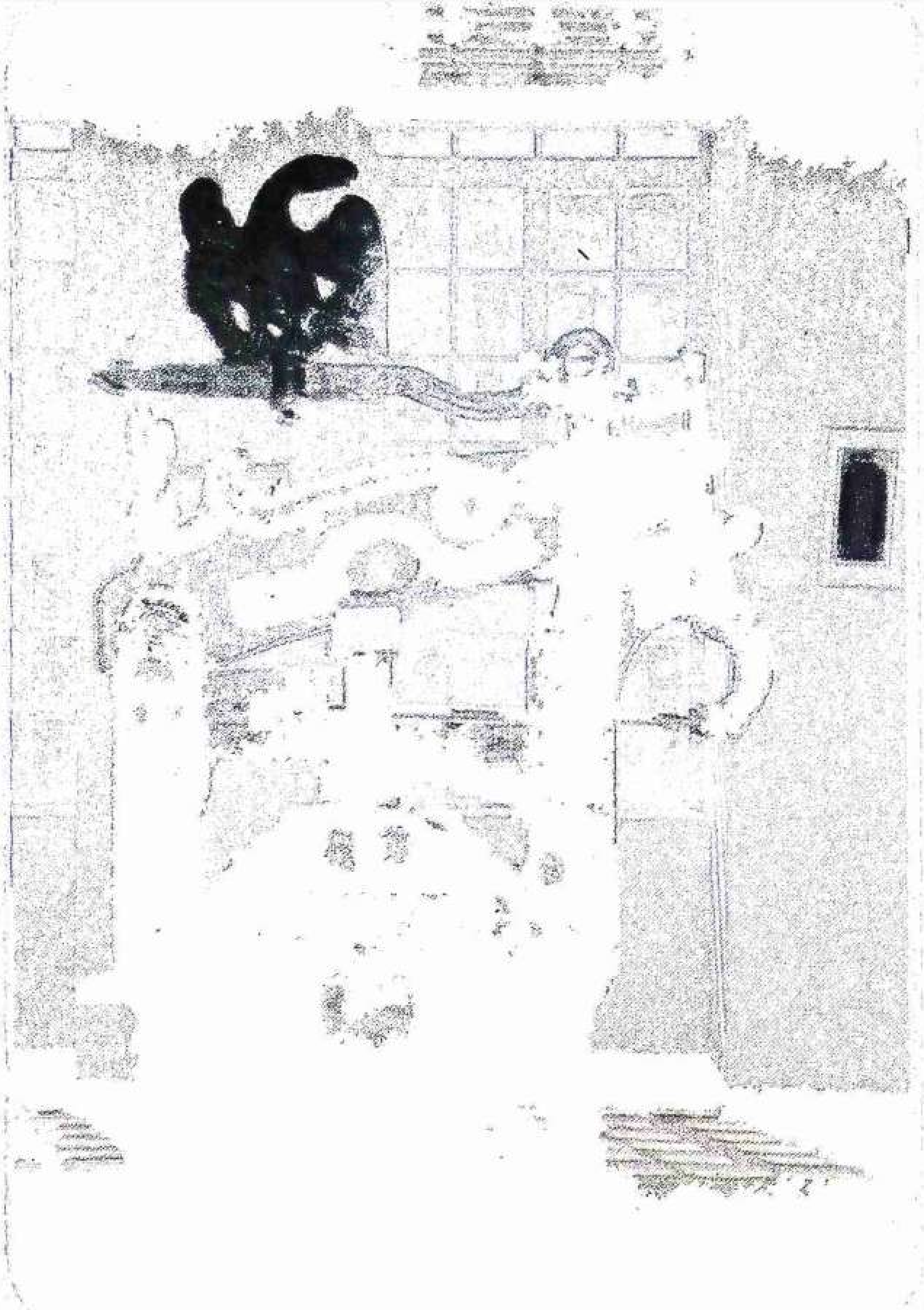

آرمینیا کے عجائب گھر میں قدیم پریس

کلچرل میوزیم میں خاتون آرٹسٹ مصروفِ کار

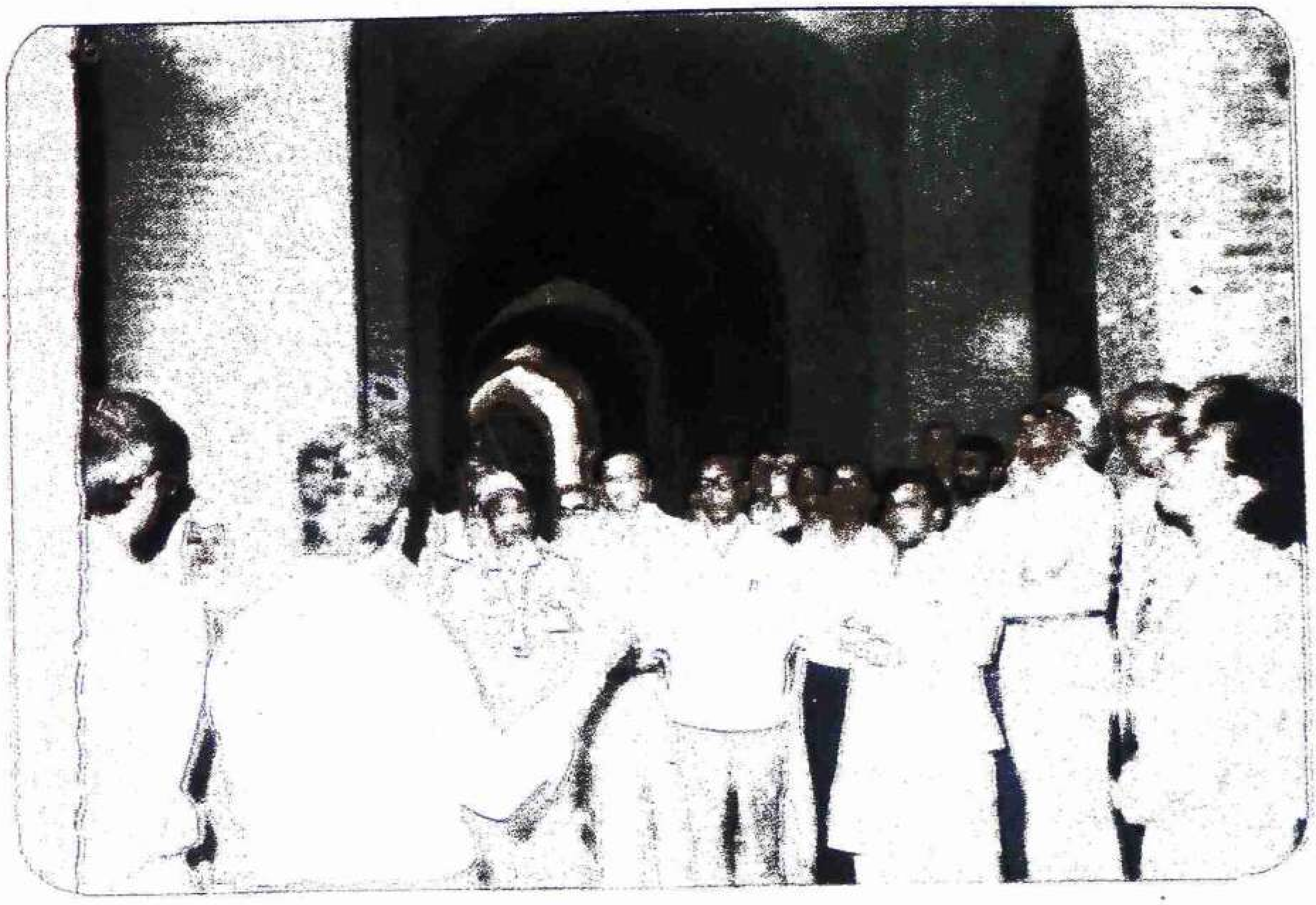

کلچرل میوزیم میں بریفنگ

زُورخانے میں ایرانی پہلوانوں کی ورزش

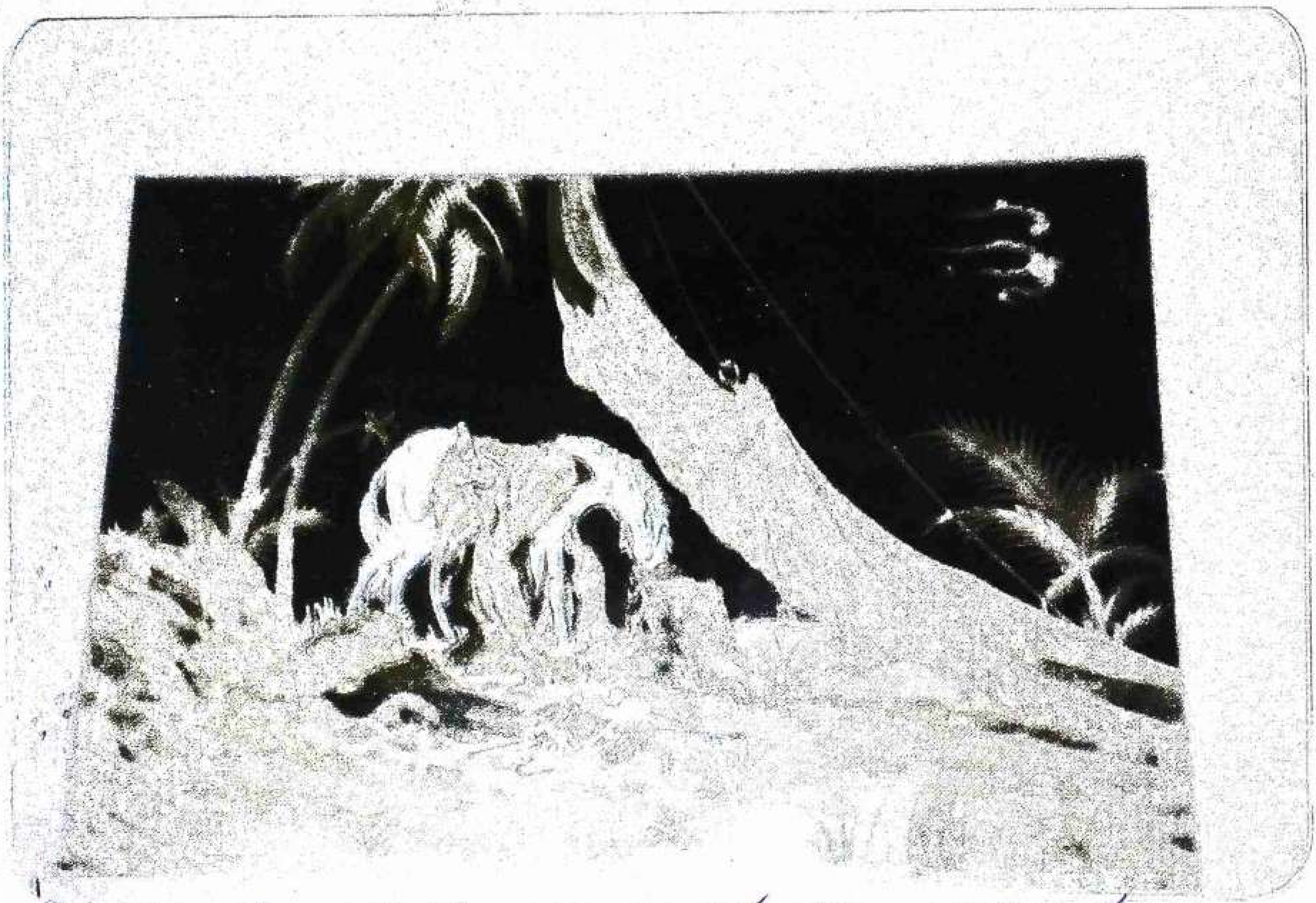

لکڑی کے ٹکڑوں سے ذوالجناح کی خیام واپسی کا منظر، فن کا ایک نادر نمونہ

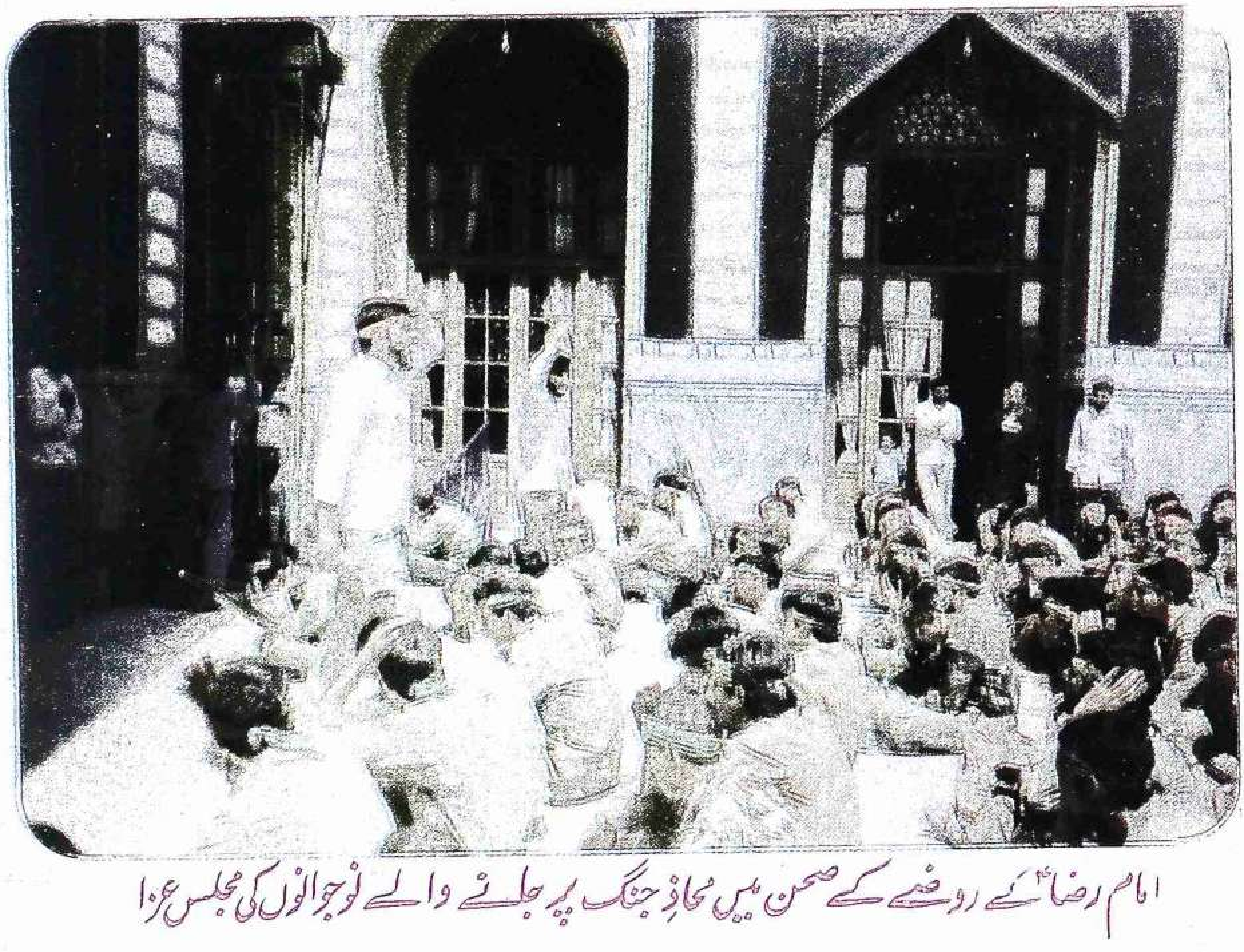

امام رضاؑ کے روضے کے صحن میں محاذِ جنگ پر جلنے والے نوجوانوں کی مجلس عزا

یہ کیسی دوغلی پالیسی ہے۔ اقوامِ عالم نے اس پر اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ ہم لیبیا اور شام کو تسلیم کرتے ہیں مگر افغانستان میں ایک DEPENDENT حکومت کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے ہم کسی بھی شرط پر کسی قوم پر بھی بڑی طاقتوں کی بالادستی قبول نہیں کرتے۔ اگر فرانس اور برطانیہ کے لوگ بہادر ہیں تو اپنے حکمرانوں سے سوال کریں کہ کیا وہ ظالم نہیں ہے جو ۲۴۰ معصوم لوگوں کو مار دیتا ہے۔ اب سلامتی کونسل کی قرارداد کی منظوری کے بعد نیا تجربہ ہو رہا ہے۔

پہلے وہ کہتے تھے ایران جنگ پسند کرتا ہے، یہ قرارداد قبول نہیں کرے گا۔ ہم کہتے تھے پہلے کمیٹی قائم کرو۔ عراق کا خیال تھا وہ ہمارے وسیع علاقوں پر قبضہ کر لے گا۔ وہ دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہمارے پاس بہت فوج ہے اب ہم پہلے سے بھی زیادہ مضبوط و متحد ہیں۔ ہم نے کسی کمزوری کی بناء پر اس قرارداد کو قبول نہیں کیا گیا مگر عراق نے یہ جان کر کہ اب دال نہیں گل سکتی۔ اس قرارداد کو قبول کیا ہے۔ علی اکبر ہاشمی نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس کے مندوبین نے جارح کی نشاندہی کر لی ہوگی۔ آپ سے جو شخص، قوم یا حکومت ناانصافی کرتی ہے اس کی نشاندہی کریں۔

ہم نے اب تعمیر کا راستہ اپنا لیا ہے۔ ہم اس کو مضبوط بنائیں گے۔ سچائی جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ ایک روز حقائق سامنے آئیں گے۔ ہم اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ خدا سچ بولنے اور سُننے کا ساتھ دے۔" رفسنجانی کی تقریر کے اختتام کے ساتھ ہی ہال تالیوں اور درود کی ملی جلی آوازوں سے گُونج اُٹھا۔ ایک عظیم الشان کانفرنس بڑی کامیابی سے اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ منتظمین بے حد مسرور تھے اُن کی ایک طویل EXCERCISE کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

روزنامہ اطلاعات کے دفتر میں جناب محمود دوائی، الجزائر کے قومی اخبار کے ایڈیٹر،
ان کی بیگم، کرنل غفار مہدی اور افضال شاہد

ایران عراق جنگ اور عالمی رائے عامہ

۱۹۷۰ء کی دہائی تک ایران، سعودی عرب کے بعد خلیج میں تیل کے سب سے بڑے برآمد کنندہ کا درجہ حاصل کر چکا تھا اور دنیا بھر میں تیل کی اس اہم ترین منڈی میں واضح رسوخ و برتری رکھتا تھا، پھر آنے والے چند برسوں میں اُس وقت کی پاکستانی حکومت کی کاوشوں سے منعقدہ "پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس" کے نتیجہ میں مُسلم بلاک کا ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں "تیل کے بطور سیاسی ہتھیار استعمال" پر اتفاق رائے کر لینے سے ہی اس خطے میں عالمی قوتوں کے مفادات میں اضافے کی بناء پر خلیج کا حساس علاقہ سامراجی طاقتوں کی فوری توجہ کا سبب بنا اور تیسری دنیا بالخصوص عالم اسلام کے سنجیدہ اور وطن پرست حلقوں نے بھانپ لیا کہ اب سُپر طاقتوں نے اپنے مُہروں کو کس میدان میں آزمانے کا فیصلہ کر لیا ہے چنانچہ جونہی ایران میں اسلامی انقلاب کی شروعات ہوئیں، مختلف حیلوں، حربوں سے اِس انقلاب کی کامیابی میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے عالمی سازشوں کا آغاز ہو گیا۔ اِس بار عالمی سامراجی قوتوں نے ایران اور عراق کے مابین ایک دیرینہ سرحدی تنازعہ کو از سرِ نو زندہ کرنے اور اِس بہانے مسلم برادری میں پھوٹ ڈالنے، عالمی اسلامی تحریکوں کا رستہ روکنے اور علاقہ میں براہِ راست مداخلت

کے ذریعے کنٹرول کے مواقع حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور یُوں شط العرب کے طے شدہ معاملہ کو دوبارہ ہوا دی گئی جس کا مختصراً پس منظر قبائلی تمدن سے لے کر شاہ ایران کے دَور تک محیط ہے۔ شط العرب کا تنازعہ ان دونوں ہمسایہ مسلم برادر ملکوں میں کئی معرکوں کی وجہ بھی بن چکا تھا۔ دراصل شط العرب کی دوطرفہ اہمیت ہی ماضی بعید سے لے کر آج تک دونوں ممالک کے مابین وجۂ نزاع رہی ہے۔

اوّلاً تو اس علاقے میں تیل کے ذخائر اور تیل کی صنعت سے متعلق تنصیبات وسیع پیمانے پر تھیں، دُوسرے عراق کے لیے خلیج کا یہ واحد راستہ تھا —— لیکن یہ وجہ اس درجہ کی اہمیت نہ رکھتی تھی کہ اتنی طویل جنگ جاری رکھ کر دونوں ممالک کی معاشی، سیاسی، سماجی اور عسکری تباہی تک نوبت پہنچتی بلکہ جنگ سے بہت عرصہ قبل یہ تنازعہ منطقی انجام کو پہنچ گیا تھا۔ جب شاہ ایران نے جو سامراجی طاقتوں کا آلۂ کار بن کر علاقائی تھانے دار کا کردار ادا کرنا چاہتا تھا، وسائل اور فوجی قوت کی برتری کے بل بوتے پر ۱۹۷۵ء میں عراق سے ایک معاہدہ پر دستخط کرانے میں کامیابی حاصل کرلی جس کے مطابق شط العرب کا متنازعہ علاقہ ایران کو مل گیا اور عراق کا گلف سے براہِ راست رابطہ ختم ہوگیا، عراقی صدر صدام کو اِس معاہدہ کا بہت دُکھ تھا اور وہ بھی اندر ہی اندر مناسب موقع کی تلاش اور ہر قیمت پر بیرونی دُنیا سے اسلحہ کے حصول کے جنُون میں مبتلا ہوچکا تھا۔

اِسی اثناء میں ایران میں "اسلامی انقلاب" کے نتیجہ میں امام خمینی برسرِاقتدار آچکے تھے اور امریکہ نواز شاہ حکومت کا خاتمہ ہوچکا تھا تاہم طویل آمریت اور سامراجی تسلّط کی باقیات کے خاتمہ سمیت تبدیلیوں کا عمل جاری تھا چنانچہ طے شدہ پروگرام کے تحت امریکہ اور یورپی ممالک نے ابتدائی طور پر ایران کو اسلحہ کی فراہمی بند کردی جب کہ شاہ کے دَور کی عسکری قوّت ایک طویل "عملِ جرّاحی" کے بعد اپنا مضبوط ڈھانچہ کھوکھلا کرچکی تھی، انقلاب سے قبل ایران کی تربیت یافتہ باقاعدہ مسلّح افواج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے متجاوز تھی جس کے پاس ہزاروں جدید برطانوی اور امریکی ٹینک تھے اور صرف جیٹ لڑاکا طیّاروں کی تعداد ۴۵۰ سے زائد تھی، جدید فینٹم۔۲ بمبار

طیّاروں کے دس سکواڈرن تھے۔ آٹھ سکواڈرن ٹائیگر فائٹر بمبار طیارے تھے، ایک سکواڈرن نگہداشتی فینٹم۔ ۲ طیّاروں کا تھا، میزائل بردار ہیلی کاپٹر، جدید راڈار، ہاک اور ریپر میزائل کا جدید ترین نظام جو دفاعی نقطۂ نگاہ کی بجائے خالصتاً "جارحانہ اسٹریٹیجی" پر مرتب کردہ تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔ لیکن انقلابِ ایران نے افواج کی نفری کم کر دی اور مسلسل جرّاحی کے عمل نے ایک سال میں ہی یہ نوبت پہنچا دی کہ ایران کسی اچانک جنگ کی صُورت میں فوری طور پر ۲۰۰ سے زائد جنگی طیّارے بیک وقت میدان میں نہیں لاسکتا تھا چنانچہ عالمی سامراج نے یہ وقت غنیمت جانا اور عراقی حکمرانوں کو اُن کی جنونی کیفیت سے فائدہ اُٹھا کر بہت خوبصورتی سے شیشے میں اُتار لیا اور ایک ایسی کثیر المقاصد محاذ آرائی کا آغاز کر دیا جس کے مابعد اثرات تو اگرچہ ایک لمبے عرصے تک رہیں گے تاہم اگر یہ سلسلہ اب بھی نہ رُکتا تو سامراجی طاقتوں اور عالمی غاصبوں کے وہ تمام عزائم پورے ہو جانے کے امکانات بڑھ گئے تھے جو وہ ابھی تک پُوری طرح حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اِس موضوع پر بہت کچھ لکھا اور کہا سُنا جا چکا ہے اور اب تک اس کے ہر پہلو کی تمام تر جُزئیات تک منظرِ عام پر آچکی ہیں اور ہر باخبر و باشعور شخص اِس بین الاقوامی سازش کے تانے بانے، دورانِ جنگ کی تفصیلات، اِس کے نتائج اور مابعد اثرات سے بخوبی آگاہی حاصل کر چکا ہے، یہاں ہم سیاسی و نظریاتی پیمانوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف عالمی رائے عامہ کے حوالے سے ایک بے لاگ اور مبنی بر حقائق مختصر تجزیہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے اِس معاملہ کی تہہ میں پوشیدہ پہلوؤں سے رُوشناسی حاصل ہونے کے علاوہ، ایک حقیقی اور غیر جانبدارانہ حتمی رائے قائم کرنے میں بھی کافی مدد مل سکتی ہے ۔۔۔۔

یُوں تو عالمی معیشت، سیاست اور تکنیکی مہارت کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ پر بھی سامراجی تسلّط کی بنا پر اس معاملہ کے یکطرفہ مگر تضادات پر مبنی، منفی پروپیگنڈہ نے عالمی سامراجی سازش کے اصل محرّکات سے حتی الامکان حد تک دُنیا کی توجّہ ہٹائے رکھنے کی سرتوڑ کوششیں

جاری رکھیں اور اس حد تک کامیابی بھی حاصل کرلی کہ کافی عرصہ تک اصل صورت حال اور اِس عالمی سازش میں کارفرما مذموم عزائم کی نہ صرف کافی حد تک پردہ پوشی برقرار رہی ۔ بلکہ قیامِ امن کی سنجیدہ کاوشوں کا رستہ روک کر مخصوص سامراجی مقاصد سے غیر متصادم نمائشی امن مشنوں کی خوب پبلسٹی کی گئی تاکہ ایک تو دونوں اطراف سے باخبر رہا جائے ۔ دوسرے اپنی مرضی سے مذاکراتی دَورانیے بڑھاکر یا مختلف النوع تاخیری حربوں سے جنگ کو طوالت دی جاسکے ۔ اسی بناء پر شام کے صدر حافظ الاسد ، لیبیا کے رہنما معمر قذافی اُردن کے شاہ حسین اور پی ایل او کے چیئرمین یاسر عرفات کی خلیجی تنازعہ سے لے کر جنگ کے اختتام تک مختلف سطح پر کی جانے والی قیامِ امن کی مخلصانہ کوششوں کو مسلسل سبوتاژ کیا جاتا رہا لیکن بالآخر یہ سازش ادھوری رہ گئی اور ایران نے محض جذبۂ ایمانی کے استقلال سے نہ صرف میدانِ حرب میں خلافِ توقع نتائج حاصل کرلیے بلکہ ایک ایسے وقت اچانک سلامتی کونسل کی قرارداد ۵۹۸ کو تسلیم کرلیا اور جنگ بندی قبول کرکے اُن سامراجی عزائم کے آگے بند باندھ دیا کہ جب عالمی صہیونی لابی اس موقع سے فائدہ اُٹھاکر ایک بھرپور اور آخری کاری ضرب سے ایران کے اسلامی انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے اس جنگ کا دائرہ وسیع کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی ۔ اور مغربی ذرائع ابلاغ ایران کے خلاف منفی پروپیگنڈہ پوری شدّ و مد سے چلاکر اُس کے اصولی مؤقف کو ہٹ دھرمی باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور صَرف کر رہے تھے تاکہ اِس سازش کی خالق اُن سامراجی قوتوں کو جن کے چہرے سے نقاب پہلے ہی کھسک چکے تھے ۔ بھرپور فوجی مداخلت کا جواز بھی مہیا ہوسکے نیز سامراج کے خلاف عالمی رائے عامہ کی بڑھتی ہوئی تشویش اور مخالفانہ ردِّ عمل کی شدت بھی کم کی جاسکے ——————

ایران عراق جنگ کو دو بڑے مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔

پہلا مرحلہ ۱۹۸۰ء کے اوائل میں ایرانی تیل کی تنصیبات پر عراقی فضائی حملوں سے شروع ہوا اور ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء سے کسی پیشگی اعلان کے بغیر شروع ہونے والی اِس عراقی جارحیت میں

شدت سے، ایک باقاعدہ طویل جنگ کا اصل راؤنڈ شروع ہوگیا جو جون ۱۹۸۲ء تک کم و بیش ایک ہی نہج پر رہا جب کہ دوسرا مرحلہ جولائی ۱۹۸۲ء سے لے کر ستمبر ۱۹۸۸ء میں جنگ بندی تک محیط ہے۔ عراق نے شروع ہی سے ایران کی تیل کی تنصیبات کو اپنا ہدف بنایا تاکہ ایرانی معیشت کے سب سے بڑے ستون کو نقصان پہنچا کر اس پر دباؤ بڑھایا جاسکے۔ عراقی فضائیہ کے پاس ۳۰۰ جدید جیٹ لڑاکا طیارے، ایک سکواڈرن TU-12 بمبار طیارے، چار سکواڈرن مگ 23 فائٹر بمبار طیارے ایک سکواڈرن ہلکے بمبار طیارے، تین سکواڈرن SU-7 فائٹر بمبار طیارے، چار سکواڈرن ایس یو-20 فائٹر بمبار طیارے، ایک سکواڈرن ہنٹر طیارے اور پانچ سکواڈرن مگ-21 جنگی طیارے تھے (میراج لڑاکا طیارے، ایف 1 طیارے اور مگ ۲۷ کی دورانِ جنگ حصولیابی کے لیے دیئے گئے آرڈر اس کے علاوہ تھے) عراق کی زمینی افواج کی باقاعدہ تربیت یافتہ مسلح نفری دو لاکھ تھی جسے ایران کی اَبتر عسکری حالت کے مقابلہ میں مکمل تیاری اور فائٹنگ فارم میں رکھا گیا تھا، عراقی زمینی افواج کے پاس ۲۵۰۰ جدید ترین رُوسی اور فرانسیسی ٹینک تھے، ہزاروں بکتر بند گاڑیاں، اینٹی ایئر کرافٹ گنیں، ایئر ڈیفنس کا بہتر نظام، مختلف میزائل اور کیمیاوی ہتھیار اس کے علاوہ تھے، عراق نے پہل کرتے ہوئے ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو بھرپور جنگ شروع کی اور فضائی بُرتری کی بنا پر پہلے ہی حملے میں ایران کے دس ہوائی اڈوں کو اچانک لیکن منظم طور پر نشانہ بنا کر ایرانی فضائیہ کو بہت بڑا نقصان پہنچایا اور یوں ایرانی فضائیہ شروع ہی سے دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۸ سالہ طویل جنگ کے پہلے ہی سال ایران کے کم و بیش سو جنگی طیارے تباہ کر دیئے گئے۔

اس جنگ کے آغاز میں ہی بین الاقوامی ردِعمل اور قیامِ امن کے لیے جنگ بندی کی اپیلیں شروع ہو چکی تھیں صیہونی لابی کے زیرِ اثر ذرائع ابلاغ کے منفی پروپیگنڈہ کی شدت کے باوجود غیر جانبدار میڈیا جنگ کے پس پردہ عوامل کو زیرِ بحث لا رہا تھا، انہی دنوں ہانگ کانگ کے ایک کثیر الاشاعت جریدہ میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں بین الاقوامی شہرت کے حامل

دفاعی مبصر جنرل وان ہیکم نے تحریر کیا کہ " اس جنگ میں عراقی فضائی کمان چونکہ براہِ راست " اعلیٰ دماغوں" کی نگرانی میں ہے چنانچہ فضائی معرکوں میں اس کی برتری ناقابلِ فہم نہیں" مضمون نگار آگے چل کر لکھتا ہے کہ " فضائی برتری اور ابتدائی فتوحات کے باوجود عراق " اپنے حامی نما آقاؤں کے ہاتھوں کھلونا بنے رہنے پر مجبور ہے اور اپنی منشا کے مطابق جنگ بندی کا اختیار نہیں رکھتا"۔

رُوسی ٹیکٹس کے تحت عراق نے مگ - 21 طیاروں کو " فضا سے فضا میں مار کرنے والے " متزا - 550 طلسمی (انفرا ریڈ) ہولناک میزائیلوں سے لیس کر رکھا تھا جو اس کی فضائی برتری میں نہایت کارگر ثابت ہوئے ، اسی برتری کے بل بوتے پر کئی بار عراقی طیاروں نے ایران پر روزانہ ۱۵۰ حملے بھی کیے جب کہ دوسری جانب دورانِ جنگ ایران کو امریکہ اور برطانیہ سمیت یورپی ممالک سے اسلحہ کی ترسیل بند کر دی گئی ، کئی ممالک سے سفارتی تعلقات کا خاتمہ ہوا ، یورپی برادری نے صیہونی لابی کے زیرِ اثر ایران کے اقتصادی بائیکاٹ کی مہم چلائی اور ایک گہری سازش کے تحت چند عرب ممالک کو سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت ، قیامِ امن کی کوششوں پر دھیان دینے کی بجائے ایران کے خلاف عراقی جارحیت کا ساتھ دینے پر آمادہ مجبور کیا گیا - ۱۹۸۱ء میں دورانِ جنگ ایران نے عالمِ اسلام کے وسیع تر مفاد میں جنگ بندی کے لیے یہ پیشکش کی کہ وہ عراق کی جغرافیائی سالمیت کا احترام کرنے ، عراق کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے ، اچھے ہمسایوں کے روابط رکھنے اور چھوٹا طنب ، بڑا طنب اور جزیرہ ابُوموسیٰ عربوں کو واپس کرنے کے لیے تیار ہے جب کہ اس کے عوض اس کا صرف یہ مطالبہ تھا کہ عراق غیر مشروط طور پر اپنی فوجیں سابقہ پوزیشن پر واپس لے جائے ، ایران کو تاوانِ جنگ ادا کرے اور بین الاقوامی ٹریبونل جارح کا تعین کرے ، لیکن سامراجی عزائم کے تابع جارح نے ایران کی اس پیشکش کو قبول کرنے میں بُوجُوہ غیر ضروری پس و پیش سے کام لیا چنانچہ جنگ بندی کے امکانات معدوم پا کر ایران نے بھی اپنی پیشکش پر زیادہ اصرار نہ کیا اور من حیث القوم " فتح یا موت " سے ہمکنار ہونے تک جنگ لڑنے کا عزم کر لیا ، اگرچہ ایران کے لیے یہ وقت انتہائی نامساعد صورت حال کا حامل تھا اور

داخلی و خارجی دونوں سطحوں پر اس کے لیے مشکلات میں اضافہ ہو چکا تھا تاہم ایران کے عظیم رُوحانی پیشوا امام آیت اللہ رُوح اللہ خمینی نے انتہائی تدبّر، فراست اور دُوراندیشی سے کام لیتے ہوئے غیرت مندانہ رستہ اپنایا اور قوم میں اپنے ولولہ انگیز خطبات و احکامات سے جہاد کی نئی رُوح پھونک دی۔ اس مرحلہ پر سب سے زیادہ قربانی ایرانی عوام نے دی اور ایک زندہ قوم ہونے کا ثبوت اس نعرے کو حقیقت میں بدل کر دیا کہ "ہم سرزمینِ وطن کے چپّہ چپّہ کا دفاع کریں گے۔"

اِس دورانیے میں ایران سے روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کا یہ پہلو بھی ایک قابلِ غور نکتہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ حالتِ جنگ میں کسی ملک کو اس کے اپنے اتحادی کس طرح غیر محفوظ کر سکتے ہیں کہ عراق دورانِ جنگ، فرانس اور رُوس سمیت مختلف ممالک سے کھلے عام اور چوری چھپے پوری دُنیا سے سامانِ حرب اور فاضل جنگی پُرزے خرید کر سکتا تھا جبکہ ایران اپنے ان اتحادیوں امریکہ اور برطانیہ سے جن کے ساتھ اس کے دفاعی معاہدے تک موجود تھے، یہ سامان حاصل نہیں کر سکتا تھا اس لیے آپس کی اس تھکا دینے والی اعصاب شکن جنگ کے پہلے مرحلہ میں عراق کا پلّہ بھاری رہا مگر ۱۹۸۱ء کے وسط میں ایرانی حملوں میں شدت پیدا ہوگئی اور ایران نے اگست ۱۹۸۱ء میں آبادان کا علاقہ عراق سے واپس لینے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جنگ کے آغاز سے لے کر اَب تک ایران کی یہ پہلی بڑی کامیابی تھی۔ مارچ ۱۹۸۲ء میں ایرانی افواج نے گلف سے ۱۵۰ میل دُور شمالی جانب دیزفل کے مقام پر ایک ہفتہ کی گھمسان کی جنگ میں عراقی فوج کو زبردست ہزیمت سے ہمکنار کر کے اسے ۲۰ میل دُور دھکیل دیا۔ اِس معرکہ میں ۶۰۰ عراقی ٹینک تباہ ہوئے جب کہ ۲۰،۰۰۰ سے زائد عراقی مارے گئے۔ یوں ۱۹۸۲ء میں ایران کی پوزیشن مستحکم ہونے کی بناء پر عراق کی جانب سے جنگ بندی کے لیے کوششوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

عراق کی درخواست پر متعدد عالمی اداروں اور رہنماؤں نے جنگ بندی کے لیے کوششیں

شروع کردیں۔

موتمرِ عالمِ اسلامی، اسلامی اُمّہ امن کمیٹی، عرب لیگ، سارک ممالک، اور اقوامِ متحدہ کے اُمن مشن کام میں پیش پیش رہے لیکن اپنی سابقہ پیشکش قبول نہ کیے جانے کے ردِ عمل اور بدلی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر ایران نے جنگ بندی کے لیے اپنی شرائط میں بعض ترامیم اختیار کرلیں، ایران کا مطالبہ تھا کہ عراقی صدر صدام اقتدار سے دستبردار ہو جائیں عراق جارحیت کے ارتکاب پر ایران کو ۱۵۰ بلین ڈالر بطور تاوانِ جنگ ادا کرے اور عراق کی جانب سے زبردستی ایران میں دھکیلے جانے والے ایک لاکھ عراقی باشندے واپس لے۔

اِن شرائط پر فوری طور پر کوئی تصفیہ نہ ہو سکا تاہم اکتوبر ۱۹۸۲ء میں عراق نے معاہدۂ الجزائر کے تحت اپنی افواج واپس بلانے کا اعلان کرکے جنگ بندی کی ایک اور کوشش کی مگر ایران اپنی شرائط تسلیم کرانے کے مؤقف پر سختی سے ڈٹا رہا چنانچہ مختلف سطح پر ہونے والی امن کوششیں تعطل کا شکار ہوگئیں۔ اور متحارب ممالک نے اسلحہ اور فاضل پُرزوں کے حصول اور متواتر فراہمی کے لیے بھاگ دوڑ میں اضافہ کردیا۔ اِس موقع پر، بنیئے سے زیادہ عیّارانہ کاروباری ذہنیّت کی مالک یہودی لابی نے جسے عالمی معیشت اور سیاست میں بھی اجارہ داری حاصل تھی، تیسری دنیا کے ممالک کو عالمی سیاست کی بساط پر شطرنج کے مہروں کی حیثیت دے کر جہاں ناکارہ اور دوسرے تیسرے درجہ کا سامانِ حرب فروخت کرکے زرِمبادلہ حاصل کیا وہاں کئی نئے کیمیاوی ہتھیاروں کا تجربہ کرنے کے لیے بھی اسی میدانِ جنگ سے بھرپور استفادہ کیا اور دو اسلامی ممالک کو آپس میں دست و گریباں رکھ کے مالی فوائد کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنے خلافِ استعمال ہوسکنے والی مشترکہ قوت (ایران + عرب ممالک) کو عسکری و معاشی لحاظ سے بہت بڑے نقصانات سے دوچار کرنے میں کامیاب رہی۔ جس کے نتیجہ میں ایران جیسی پانچویں بڑی عسکری قوت، ان نقصانات کے بعد ترقی کی دَوڑ میں کئی سال پیچھے دھکیل دی گئی اور اس طرح سامراجی طاقتوں کو مالی فوائد کی نسبت زیادہ اہمیت کے حامل سیاسی و دیگر

فوائد کے حصول میں کامیابی ہوئی ۔ ۱۹۸۳ء میں عراق کو مختلف ممالک سے جنگی ہوائی جہازوں کی نئی کھیپ بھی موصول ہو گئی اس موقع پر مصر نے امریکی اشارہ پر چین سے مگ ۱۹ اور مگ ۲۱ طیارے خرید کر عراق بھیج دیئے ۔عراق نے فرانس سے بھی میراج اور ایف طیارے حاصل کر لیے اور رُوس سے بھی عراق کو جنگی طیاروں کی کھیپ موصول ہو گئی ۔یوں عراقی فضائیہ نے ایک بار پھر ایرانی فضائی افواج کے مقابلے میں جدید ترین اسلحہ حاصل کر لیا ۔ اسی دوران عراق کو جنوبی امریکہ سے ایکسوسٹ میزائل بھی مل گئے جن سے ایرانی بحری جہازوں کو نشانہ بنایا جانے لگا ۔نئی صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عراق کو ہر جانب سے بھرپور امداد مہیا کی گئی ۔عراقی فضائیہ کی بہتر کارکردگی، تنظیم نو اور از سرِ نو تربیت کی ذمہ داریاں مصری، فرانسیسی اور بھارتی انسٹرکٹروں نے سرانجام دیں ۔

عراق کو روس کی جانب سے سام میزائل کی کھیپ موصول ہوتے ہی ایرانی فضائیہ کے لیے مشکلات میں اضافہ ہو گیا ۔ لیکن عراق اس فضائی برتری سے انقلاب اسلام کے پیچھے کارفرما جذبہ اور پوشیدہ قوتِ ایمانی کو زیر نہ کر سکا اور ایرانی عوام کے حوصلے بلند رہے ۔ایرانی انفنٹری کے جذبۂ شہادت نے اس جنگ میں ایسی ایسی بے نظیر مثالیں قائم کیں کہ عقل دنگ رہ گئی ۔ بھاری جانی و مالی قربانیاں دے کر بھی ایرانی زمینی افواج بالخصوص پیدل ڈویژن نے اس قدر دباؤ رکھا کہ اگر عراق عالمی حکمتِ عملی کے تابع جنگ بندی کے ذریعہ اس طویل جنگ کے جال سے نکلنے میں کامیاب نہ ہوتا تو اس کی مکمل معاشی و معاشرتی تباہی میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا ۔ ۱۹۸۳ء میں مختلف قوتوں کی پُشت پناہی پر عراق کی جانب سے کیمیاوی ہتھیاروں کے بے دریغ استعمال اور تیل کی تنصیبات اور فوجی تنصیبات کے علاوہ ایران کی شہری آبادیوں پر وحشیانہ بمباری کا سلسلہ شروع ہونے پر ایک مرحلہ ایسا بھی آیا ۔ جب عراق مشینی برتری اور عالمی دباؤ کے حوالہ سے ایران پر سبقت حاصل کر چکا تھا جب کہ ایران کو ان دنوں ایک طویل مدت تک وحدہٗ لاشریک لہٗ پر لازوال تقویٰ سے منور انسانی جذبۂ ایمان اور ایرانی افواج و عوام کے جذبۂ جہاد پر قناعت کرنا پڑی ۔صُورتِ حال کی وضاحت کے لیے بھی ایک مثال کافی ہے

۱۹۸۴ء تک ایران کے پاس عراق کے بے پناہ ساز و سامان کے مقابلہ میں صرف ۷۵ جنگی جہاز رہ گئے تھے۔ فضائی جنگ جیتنے کا جو ماہرانہ طریقۂ کار عراق نے اپنے "حامیوں" کے "ہر ممکن تعاون" سے اختیار کیا تھا، جنگی نقطۂ نگاہ سے اگرچہ وہ کافی حد تک کامیاب رہا لیکن عراق اس فضیلت سے صحیح فائدہ نہ اُٹھا سکنے پر مجموعی طور پر یہ جنگ جیتنے کا موقع گنوا بیٹھا اور ایرانی قوم کی لازوال قربانیوں نے انہیں ساز و سامان کی کمی کے باوجود اس طویل معرکہ آرائی میں سُرخروئی بخشی۔ عراقی فضائی معرکوں میں اس کا پلّہ بھاری رہا لیکن زمینی جنگ میں عراق کو یہ "مخصوص اضافی قابلیت" مؤثر طور پر دستیاب نہ ہونے کی بنا پر ہزیمت اُٹھانا پڑی۔

بین الاقوامی جریدہ "ایشیا ویک" نے اس صورتِ حال پر بڑا خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ جریدہ لکھتا ہے کہ "عراق کے پاس "بے پناہ سامانِ حرب اور "مؤثر حامی" تھے جب کہ ایران کے پاس "ذخائر" اور "جذبہ کی قوّتیں" تھیں اسی سیاق و سباق میں آسٹریلیا سے شائع ہونے والے ایک روزنامہ میں ایک تجزیہ پیش کیا گیا جس میں دیئے گئے اعداد و شمار مندرجہ بالا تبصرے کے ثبوت میں ایک واضح شہادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ تجزیہ نگار جوجی ٹارٹو لکھتا ہے کہ:

"عراق" کے ذریعہ عالمی طاقتوں کی سازش "ہر قسم کی برتری کے باوجود ایران کے اسلامی انقلاب میں پنہاں جذبۂ صادق کو اتنا نقصان بھی نہ پہنچا سکی جتنا کہ عموماً مخصوص موسمی حالات کی بنا پر اس نوعیت کی طویل جنگوں میں پہنچتا ہے، اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ سخت سردی اور موسمی تغیّرات کے نتیجہ میں پہنچنے والے نقصانات، ان نقصانات سے کہیں زیادہ تھے جو عراق کے ذریعے صیہونی مفادات کی طویل جنگ میں ایران کو پہنچے"۔ آگے چل کر جوجی لکھتا ہے کہ "اگر ہم غیر تکنیکی انداز میں منطق کے حوالہ سے اس بات کا جائزہ لیں تو عراق کا تمام تر بیرونی امداد و حمایت اور جنگی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کیمیاوی ہتھیاروں سمیت ہر حربہ آزمانے میں ناکامی پر بالآخر مخصوص عالمی حکمتِ عملی کے تابع، مصلحت کیش روش کا سہارا لینا ہی دراصل

ایران کے موقف کی سچائی کی دلیل تھا۔

اس تجزیہ سے ہمیں یہ ثبوت ملتا ہے کہ تمام اسلام دشمن طاقتوں کا اسلام کو اپنے لیے خطرہ نمبر ۱ قرار دیتے ہوئے اسے کہیں بھی طاقتور نہ ہونے دینے کی مذموم سازشوں میں " انتہائی اعلیٰ سطحی " مشترکہ حکمتِ عملی اپنانا بھی " معبودِ حقیقی " کے اس وعدہ پر انسان کے پختہ یقین کو متزلزل نہ کر سکا کہ " اپنے دین اور حق پر ڈٹ جانے والوں کی رہنمائی و تائید کا وہ خود ذمّہ دار ہے "

اس جنگ کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ جب اس عالمی سازش کے درپردہ دماغ ایک ایک کر کے بے نقاب ہونے لگے، اکتوبر ۱۹۸۰ء میں امریکہ تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پوری طرح اپنے بیرونی خول سے باہر آگیا اور اس نے خلیج میں اپنے بحری بیڑے روانہ کر دیئے۔ یوں خلیجی ممالک کی چوکیداری کے بہانے خود عملی طور پر ایران کے خلاف جنگ میں شامل ہوگیا۔ امریکہ کی جانب سے سعودی عرب کو وارننگ سسٹم بردار ریڈار پروف جاسوسی اواکس طیاروں کی فراہمی بھی عالمِ اسلام کے حق میں نہیں بلکہ کسی نئے محاذ کی متوقع ضروریات کے تحت نیز قوتِ اسلامی کے دم خم سے باخبری اور کسی جانب سے متوقع حملہ کی پیش بندی کے طور پر کی گئی تھی۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے امریکہ نے یہودی مفادات کے تحفظ میں بدنام زمانہ سی آئی اے اور دیگر تنظیموں کی مدد سے ایران کے سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک سے روابط خراب کرنے کے لیے بے شمار منصوبوں پر عمل کیا جن میں اسے دورانِ جنگ جزوی کامیابی بھی ملی۔ مزید برآں صہیونی لابی کے زیر اثر ذرائع ابلاغ کی غالب تعداد ان سازشوں کی کامیابی اور مسلم برادری میں پھوٹ ڈالنے کے لیے منفی پراپیگنڈہ کا عمل پوری شد و مد سے جاری رکھا۔

مشہور بھارتی صحافی دلیپ مکرجی ۳ ستمبر ۸۸ء کی اشاعت میں ایران عراق جنگ کے موضوع پر " LESSON FOR THE 3RD WORLD " کے عنوان سے لکھتا ہے کہ

" خلیج کی جنگ میں امریکہ کی براہِ راست شرکت ، سامراجی عزائم کو بے نقاب کرنے

کے لیے کافی ہے تاہم تمام تر کوششوں کے باوجود ایرانی قوم کے جذبہ نے ایک جارح اور اس کے حمائتیوں کے عزائم کو پھلنے پھولنے نہیں دیا۔"

آٹھ سالہ طویل جنگ کے چوتھے سال عراق نے مختلف ذرائع سے بے پناہ سامانِ حرب اور امداد حاصل کی (اس میں ایک عرب ملک کے کہنے پر خلیجی ممالک کی بے پناہ مالی امداد بھی شامل تھی جس سے خلیج کی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی) لیکن یہ تمام تر امدادیں اس کی بری افواج کی شرمناک ہزیمت کے باعث بے سُود رہیں۔ برطانوی جریدے "ڈیلی مرر" کی ایک رپورٹ کے مطابق "یوں لگتا تھا کہ عراقی بکتر بند ڈویژن، بڑی بے دلی سے لڑ رہا ہے اور پیدل افواج کی طرح مورچوں میں دبک گیا ہے جبکہ ایرانی پیدل فوجی ٹینک بن گئی تھی اور اور ٹینکوں پر کُود کُود کر حملے کر رہی تھی۔

عراقی آرمرڈ کور کی یہ نالائقی عراق کو تقریباً ۳۵۰ بلین ڈالرز میں پڑی اور ایران کے نائب وزیر خارجہ نے ۱۹۸۵ء میں کی جانے والی امن کوششوں کے جواب میں عراق سے ۳۵۰ بلین ڈالرز بطور تاوان ادا کرنے کا مطالبہ کر دیا۔

اِس صورتِ حال سے گھبرا کر عراق اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آیا اور اس نے ایران کے حامی کردوں پر کیمیاوی ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا جس پر عالمی رائے عامہ نے شدید احتجاج کیا۔ متعدد ممالک نے عراق کو ایران کی شہری آبادیوں پر بمباری اور کیمیاوی ہتھیاروں کے استعمال کو بند کرنے کا مطالبہ کیا۔ عالمی ردِّ عمل کی دیکھا دیکھی کئی مغربی ممالک نے بھی عراق کی مذمت شروع کر دی۔ اقوامِ متحدہ نے کیمیاوی ہتھیاروں کے استعمال کے معاملہ کی تحقیقات کیلئے ایک ٹیم تشکیل دی جس نے اس امر کی تصدیق کی۔ اقوامِ متحدہ کی تفصیلی رپورٹ کے مندرجات جنگ بندی کے بعد منظرِ عام پر آئے جن کے مطابق عراق نے ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء میں کئی مرتبہ کیمیاوی ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ "یوں لگتا ہے جیسے عراق کیمیاوی ہتھیاروں کے ذریعہ ایران کے حامی

کُردوں کی آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے دَرپے ہے۔ اس دورانیے میں ایک لاکھ سات ہزار کُردوں نے ترکی میں پناہ لے لی۔ ایک لاکھ سے زائد کُرد ایران میں دھکیل دیئے گئے جب کہ ایک خاصی بڑی تعداد دیگر ممالک میں پناہ لینے پر مجبور کر دی گئی۔ بالآخر امریکہ نے بھی عالمی احتجاج میں شرکت کا فیصلہ کر لیا اور "طوعاً وکرھاً" عراق کی جانب سے کیمیاوی ہتھیاروں کے استعمال پر عراقی حکومت کی نہ صرف زبانی مذمّت کی بلکہ امریکی سینٹ نے عراق کے خلاف اقتصادی پابندیوں کا بِل بھی منظور کر لیا جس سے عراق کو امریکہ کی جانب سے مختلف شعبوں میں دیا جانے والا ۸۰۰ ملین ڈالر کا قرضہ منسوخ ہو گیا۔ علاوہ ازیں عراق سے تیل اور پٹرولیم کی مصنوعات کی درآمد پر بھی پابندی لگا دینے کی سفارش کی گئی اور تیل کی تلاش کے لیے کمپیوٹروں سمیت تکنیکی امداد کی فراہمی معطل کر دی گئی۔ امریکی وزیر خارجہ نے اِس معاملہ پر امریکہ کی جانب سے سخت روّیہ اپنانے کا اعلان کیا۔ اقوامِ متحدہ میں عراق کی مذمّت کی۔ اسی اثناء میں عراقی فوج نے جنگ میں ایران کا ساتھ دینے کی پاداش میں ۱۸۰۰ کُرد قبائلیوں کو گولی سے اُڑا دیا۔ اِن تمام واقعات پر عراق کی دُنیا بھر میں مذمّت کی گئی۔

اَب ہم اس جنگ میں فریقین کو پہنچنے والے نقصانات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے مابعد اثرات کے حوالہ سے متوقع رجحانات کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ اس طویل جنگ میں ایران کے چھ لاکھ اور عراق کے چار لاکھ افراد جاں بحق ہوئے، عراق کو ۲۴ بلین ڈالر اسلحہ کی خریداری پر خرچ کر کے جنگی جنون کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ بین الاقوامی انشورنس کمپنی لائیڈ کے مطابق ستمبر ۱۹۸۰ء سے اگست ۱۹۸۸ء تک خلیج فارس میں ۵۴۶ بحری تجارتی جہازوں پر حملے کیے گئے جس کے نتیجہ میں ۴۲۰ جہازراں ہلاک اور ۴۵۲ شدید زخمی ہوئے۔ امریکہ کی جانب سے ایرانی ایئر لائن کے طیارے پر حملہ کے نتیجہ میں ۲۹۸ مسافر جاں بحق ہوئے تیل کی تنصیبات، فوجی اخراجات اور معاشی تباہی کے حوالے سے دونوں ممالک کو مجموعی طور پر ۴۰۰ ارب ڈالر کا نقصان ہوا۔ اس جنگ کی وجہ سے ایران اور عراق کو صرف تیل کی برآمدی تجارت

میں ۲۴ ارب ڈالر کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ عالمی ادارہ محنت کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اِس جنگ کے خاتمہ پر دونوں ممالک کو تعمیرِ نو کے لیے پچاس لاکھ فنّی ماہرین درکار ہوں گے ۔ اقوام متحدہ کی اقتصادی کمیٹی کا کہنا ہے کہ دونوں ممالک کو اقتصادی بحالی کے لیے ۳۰ ارب ڈالر درکار ہوں گے۔ اس جنگ سے خلیج کی ترقیاتی سرگرمیاں یک لخت تعطل کا شکار ہوگئیں۔ خلیج کی صُورتِ حال پر اس جنگ کے حوالے سے ایک بین الاقوامی جریدہ نے یوں تبصرہ کیا

"SUPER POWERS NATURALY SHARING THE GULF CAKE"

اِس جنگ پر عالمی رائے عامہ کے ردِّ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اِس حقیقت میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ ایک بہت بڑی عالمی سازش تھی جسے ایرانی عوام کے ناقابلِ شکست جذبہ ، امام خمینی کی جرأت مندانہ قیادت اور سب سے بڑھ کر تائیدِ غیبی نے بُری طرح ناکام بنا دیا۔

اِس جنگ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے عالمی رائے عامہ نے اتفاق رائے سے درج ذیل سبق اخذ کیے ہیں ــــــ

۱۔ ایران کا موقف درست تھا ، عراق جارح ثابت ہوا ۔

۲۔ جنگ کے اوائل میں ایران نے امن کے لیے مخلصانہ کوشش کی اور جنگ بندی پر آمادگی ظاہر کی جسے بین الاقوامی سازش کے ذریعے ناکام بنا دیا گیا جس پر ایران نے آخری فتح تک جنگ جاری رکھنے کا درست فیصلہ کیا۔

۳۔ ایران کی عوامی فوج کے ریلوں کا بار بار عراقی ٹینکوں ، توپوں سے واسطہ پڑا اور کوئی بھی جدید ہتھیار مورچہ کی مٹی اور مورچہ بند ایرانی سپاہیوں کے جذبہ سے زیادہ طاقتور ثابت نہ ہوسکا۔

۴۔ اِس سے سبق ملتا ہے کہ جو فوج اس مٹی اور جذبے کا صحیح استعمال کرے گی وہ زندہ رہے گی اور ہار ماننے کی بجائے تا دمِ آخر لڑتی رہے گی خواہ عددی و سامانِ حرب کی تفاوت کی شرح کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ یہ جنگ انسان (ایران) اور جدید زمانہ کی جنگی مشین (عراق) کا مقابلہ تھا جس میں جیت انسان کی ہوئی۔

۶۔ دونوں نے لامتناہی جانی و مالی خسارے برداشت کیے اور اس جنگ کے مابعد اثرات سے یکساں طور پر دوچار ہیں۔

۷۔ ایک سبق یہ ملتا ہے کہ اگر فضائی افواج برتری حاصل کر بھی لے لیکن جنگ کے مجموعی نتیجہ میں میدان دشمن کے ہاتھ رہے تو بھی جو خطیر رقم ایئر فورس پر خرچ کی گئی وہ بیکار گئی۔

۸۔ اگر دونوں ممالک کے پاس فضائی افواج نہ بھی ہوتیں تو جنگ کا نتیجہ یہی رہتا تھا جو اب رہا۔

۹۔ عراق کو جارحیت کے ارتکاب کی پاداش میں ایران کو سالانہ ۱۲ ارب ڈالر تاوان ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

برطانوی اخبار "گارجین" میں ایف جے والٹرز ایران عراق جنگ پر ایک تفصیلی مضمون کے آخر میں لکھتا ہے کہ "ایرانی قوم خوش قسمت تھی جسے امام خمینی جیسا رہنما مل گیا جس نے اپنی بہترین حکمتِ عملی سے اس بین الاقوامی سازش کی یلغار کو یوں شکست دی جیسے ویت نام میں ہوچی منہ جیسے قائد اور جنرل گیاپ جیسے قوم پرست فوجی کمانڈر نے امریکہ کو تھکا کر مار گیا۔

ایک اور برطانوی اخبار ڈیلی ٹیلیگراف میں خلیجی امور پر جوئیل برمکلے تحریر کرتا ہے کہ:

"خمینی جنگ کا فاتح ہے جس نے حملہ آوروں اور اس کے پُشت پناہوں کے چھکے چھڑا دیئے"

جوئیل برمکلے آگے چل کر لکھتا ہے کہ "جنگ بندی قبول کر کے آیت اللہ خمینی نے اپنے مخالفین کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے اور اس جنگ بندی کے نتیجہ میں اینٹی خمینی محاذ اپنی موت آپ مر جائے گا"

سنگاپور سے شائع ہونے والے ایک معروف جریدے نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں مصطفےٰ جعفری نے اس جنگ کے اسباب و علل پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

اَب کوئی مخفی امر نہیں رہا اور اس مکروہ چہرے کی نقاب کشائی کے لیے یہ سادہ سی دلیل ہی کافی رہے گی کہ تیل کا بطور ہتھیار استعمال، کن کن قوتوں کے لیے مُستقل خطرے کی علامت تھا اور شاہ ایران جیسے سامراج نواز مطلق العنان بادشاہ کی موجودگی میں بھی یہ احساس کن پر غالب تھا کہ ایران کی اصل قوت یعنی اس کے عوام بالآخر مُسلمان ہیں اور کسی بھی وقت اسلام کے مجموعی کاز کے لیے استعمال ہو کر ان کے خلاف صف آراء ہو سکتے ہیں۔"

ذرائع ابلاغ کے حوالے سے عالمی رائے عامہ کے ردِّ عمل کا ذکر کرتے ہوئے ایک قابلِ ذکر حوالہ ضرور نقل کروں گا کہ بھارتی پریس جو عموماً اسلام دشمنی میں اپنی مثال آپ ہے، اس میں بھی عالمی ردِّ عمل بہت نمایاں طور پر شائع ہوا اور خصوصاً اس جنگ کے آخری مراحل میں بھارت کے مشہور اخبار ہندوستان ٹائمز میں اس سازش کو ناکام بنانے پر امام خمینی اور انقلابِ ایران کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا گیا " ایران کا، اسلامی انقلاب کے آغاز ہی سے عالمی سطح پر ہونے والی خوفناک سازشوں کے سامنے استقامت کا مظاہرہ اور طویل جنگ کے تمام تر نقصانات کے باوجود انقلاب کا کامیابی سے ہمکنار ہونے سے افغانستان، کمپوچیا، جنوبی افریقہ اور فلسطین سمیت دُنیا بھر میں ایک نئی سوچ اُبھر رہی ہے۔"

دورانِ جنگ ایران کو نت نئے طریقوں سے پریشان کیا جاتا رہا تاہم اپنے جذبۂ ایمانی، اتحادِ ملّی اور تائیدِ غیبی سے اس نے تمام مشکلات پر قابو پا لیا اور اپنے موقف کو کامیابی سے ہمکنار کر کے عالمی سازش کے کرتا دھرتا عناصر کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ انھی شرارتوں میں مجاہدینِ خلق نامی تنظیم کا قیام تھا جو صیہونی اشاروں پر ایران عراق جنگ میں وہی کردار ادا کرتی رہی جو سانحۂ مشرقی پاکستان میں بھارت کی تربیّت یافتہ "مکتی باہنی" نے کیا تھا۔

آج مجھے اپنے قیامِ ایران کے آخری دنوں کی وہ تقریب یاد آرہی ہے جس میں، اسلامی اُمّہ امن کمیٹی کے ایک ممبر ملک کے سفارت کار دوست نے کہا تھا کہ " ایران عراق جنگ دراصل عالمی طاقتوں کے مخصوص مفادات کے پس منظر میں بڑی طاقتوں کی تیسری دُنیا کی آزاد نما محکوم آبادی

کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کی برسہا برس سے جاری سازشوں کی ہی ایک کڑی تھی"۔
اِس سارے معاملے کو اگر اختصار میں بیان کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عالمی سازشوں نے مندرجہ بالا گفتگو کے عین مطابق تیسری دنیا بالخصوص اسلامی بلاک کو زک پہنچانے اور اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل کے لیے اس جنگ کا تانا بانا بُنا اور اسے طوالت دے کر دو اسلامی ممالک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ مسلمان ہی جانی و مالی نقصانات سے دوچار ہوئے، مُسلمانوں کی ہی تجوریاں قیمتی زرِ مبادلہ سے خالی ہوئیں اور آپس میں دشمنیاں ختم ہونے کی بجائے زیادہ مستحکم ہوئیں۔

ایران سے روانگی سے محض ایک روز قبل ایک ملاقات میں ایک خلیجی دوست نے جو میڈیا سے وابستہ ہیں ایک انوکھی دلیل پیش کی جس کا یہاں ذکر برمحل معلوم ہوتا ہے۔ میرے فاضل دوست کا کہنا تھا کہ " اگر اس جنگ کو علاوہ دیگر نقصانات کے عربوں کی کمائی کے تیس کھرب روپے ہتھیانے کی گیم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا"۔

دونوں اطراف سے ایک ہی خدا، ایک ہی نبی اور ایک ہی مذہب کے دس لاکھ سے زائد پیروکار اپنی قیمتی جانوں سے محروم ہوئے، جب کہ دونوں ممالک کے ایک لاکھ پندرہ ہزار جنگی قیدی ۲۰ اگست ۱۹۸۸ء کی جنگ بندی سے اب تک قیدیوں کے باہمی تبادلہ کے معاہدہ کے منتظر ہیں، ان کی اکثریت معذور ہو چکی ہے یا شدید زخمی ہے۔ ریڈ کراس کی رپورٹ کے مطابق ایران میں عراقی جنگی قیدیوں کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ایران عراق سمیت اسلامی ممالک کو معیشت کو پہنچنے والے نقصانات کے اعداد و شمار اس سے بھی زیادہ خوفناک ہیں۔

اِس جنگ بندی سے عراق کے سرحدی اور پہاڑی علاقوں میں آباد دس لاکھ سے زائد کُردوں کو بھی بجا طور پر تشویش لاحق ہو گئی ہے کیونکہ انہیں جنگ بندی کے بعد اپنی خودمختاری کی جدوجہد کو پوری طاقت سے جاری رکھنا فوری طور پر ناممکن ہو گیا ہے تاہم اس جنگ بندی

سے ایسے تمام ممالک کو اطمینان ہوا ہے جن کے مفادات خلیج سے کسی نہ کسی طور وابستہ ہیں۔ بالخصوص اس جنگ میں دونوں ممالک کی اقتصادی بدحالی کے نتیجہ میں مغربی ممالک کے مفادات ایک لمبے عرصے تک محفوظ ہو گئے ہیں۔ مزید برآں دونوں ممالک کو تعمیر نو کے لیے سازو سامان اور فنی تعاون و اشتراکِ عمل کے لیے مغربی ممالک کی ضرورت پڑے گی جس سے نہ صرف مغرب کو سرمایہ کاری کے لیے نئے میدان میسّر آئیں گے بلکہ فنّی و مالی امداد اور ماہرین کی فراہمی کے بہانے ان ممالک میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کا موقع ملے گا۔ متوقع سرمایہ کاری کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خلیج فارس کے صرف آبی رستوں کی اصلاح کے لیے مغربی کمپنیوں کی ایک ارب ڈالر سے زائد کی سرمایہ کاری کا امکان ہے، اسی طرح برطانیہ سمیت مختلف یورپی ممالک کی ڈیڑھ سو سے زائد کمپنیوں نے ایران میں تیل کی صنعت کی بحالی کے لیے کنٹریکٹ حاصل کرنے کے لیے یلغار کر رکھی ہے۔ علاوہ ازیں برادر اسلامی ممالک اور عوامی جمہوریہ چین سمیت دیگر ممالک سے بھی بحالی کے کاموں کے میں اشتراک حاصل کیا جائے گا۔ عراق کو بحالی کے کاموں میں دوہری دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ایک طرف تو اسے تباہ شدہ معیشت اور معاشرت کی از سرِ نو بحالی کا چیلنج درپیش ہے۔ دوسرے اُسے بطور تاوانِ جنگ سالانہ ۱۲ ارب روپے کی خطیر رقم ایران کو ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جن عرب ملکوں اور خلیجی ریاستوں سے قرض لے کر عراق نے جنگ جاری رکھی، ان قرضوں کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کی صورت میں ان ممالک کی ناراضگی کا مسئلہ عراق کے رہے سہے اوسان خطا کرنے کا باعث بنا ہوا ہے۔

ہمیں بہت جلد پوری سنجیدگی سے یہ احساس کرنا ہوگا کہ اس قسم کی جنگوں میں اپنوں کے خلاف دشمنوں کا آلۂ کار بننے سے دشمنوں کی جیب بھرنی ہے اور اپنے قبرستان!

ہمیں اپنے مشترکہ دشمنوں کو پہچاننا ہوگا۔ ان استعماری قوتوں کے ہر ہتھکنڈے کو

ناکام بنانا ہوگا جو ہمارے درمیان نفاق کا بیج بو کر ہمارے ہی وسائل سے ہمی پر حکومت کرتی ہیں اور جنہوں نے اپنی چوہدراہٹ کو درپیش ہر خطرے کو دور کرنے کے لیے ہر قسم کا حربہ آزما کر تیسری دنیا بالخصوص مسلم بلاک کو اپنی مکروہ سازشوں کی مستقل آماجگاہ بنا رکھا ہے۔ یہاں پر چند ایسے واقعات کا تذکرہ برمحل ہوگا جن سے اندازہ لگایا جا سکے کہ عراقی فوج نے کن فوجی محاذوں اور شہری آبادیوں پر کیمیائی ہتھیاروں کو استعمال کیا۔

خیبر آپریشن

اگرچہ عراق نے اپنی طرف سے مسلط کردہ جنگ کے آغاز ہی میں کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال شروع کر دیا تھا تاہم اس کی مقدار میں اضافہ خیبر آپریشن اور مزنون جزائر کی آزادی کے وقت سے شروع ہوگیا تھا۔ رجسٹر کردہ مواد کے مطابق عراق نے ۲۲ فروری ۱۹۸۴ء کو اس آپریشن کے شروع کرتے ہی ایرانی فوجوں پر جنگی محاذوں اور آرٹلری کے ذریعے کیمیائی بم اور ہتھیار گرانا شروع کر دیئے تھے اور یہ سلسلہ ایرانی سال کے خاتمے ۲۰ مارچ ۱۹۸۴ء تک پوری طرح جاری رہا تھا۔ ان حملوں کے نتیجے میں بیسیوں فوجی شہید ہوگئے تھے جبکہ ۲ ہزار سے زائد بُری طرح زخمی ہوگئے تھے اور ان کے جسم جل گئے تھے۔ اسی طرح ۲۷ فروری ۱۹۸۴ء کے

ایک فضائی حملے میں ۱۱۰۰ کے قریب اسلامی فوجی زخمی ہو گئے تھے۔ کیمیائی ہتھیاروں کے ذریعے یہ حملہ حورالحوزشیں کے علاقہ میں کیا گیا تھا۔ اِس علاقہ میں کیمیائی گیسوں کے بڑے پیمانے پر اِستعمال کی وجہ سے آپریشن میں حصّہ لینے والے فوجیوں کی ہلاکتوں اور نقصانات کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ اس کے باوجود ایرانی فوجیوں نے خیبر آپریشن کے ذریعے اپنے مقاصد کا حصول جاری رکھا اور تیل کی دولت سے مالا مال مدنون جذائر پر قابض ہو گئے۔ عراقی فوجوں نے صرف خیبر آپریشن کے علاقہ میں کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیا بلکہ مہران سیکٹر میں بھی بمبار طیّاروں اور آرٹلری کے ذریعے کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کا مرتکب ہوا۔ جس کی وجہ سے بدقسمتی سے اِس سیکٹر میں نقصانات بہت اہمیّت اختیار کر گئے تھے۔

بدر آپریشن

خیبر اور بدر آپریشن کے درمیانی عرصوں میں جو کہ تقریباً ایک سال پر محیط تھا، عراق کی جانب سے کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال بہت شدّت اور وسعت اختیار کر گیا تھا۔ حورالحوازش کے علاقہ میں بدر آپریشن کے شروع میں عراقی حکومت نے اپنی فوجوں کو مزید کئی طرح کے نئے کیمیائی ہتھیاروں سے لیس کرنا شروع کیا جن میں اعصابی گیس اور بلسٹر گیس کے علاوہ سیانائیڈ اور اِنسانی جسم میں خون کی گردش کو متاثر کرنے والی گیسوں کو استعمال میں لانا شروع کیا اور ۱۱ مارچ ۱۹۸۵ء سے ۱۸ اپریل ۱۹۸۵ء کے درمیانی عرصہ میں عراقی پائلٹوں اور گنرز نے آپریشن کے علاقہ میں دن میں متعدد بار کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کے ذریعے اِن حملوں کی تعداد ۵۰ کے قریب تھی۔

اگرچہ ایرانی فوجوں کو کیمیائی ہتھیاروں سے پہلے بھی سابقہ پڑ چکا تھا اور انہیں اس سے بچاؤ کے لیے مناسب آلات اور ٹریننگ بھی فراہم کی گئی تھی لیکن اس کے باوجود ہزاروں فوجی بُری طرح مجروح یا زخمی ہوئے۔ آپریشن کے علاقہ میں کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کے علاوہ

سپلائی لائنز اور آپریشن کے علاقہ سے پرے کے راستوں پر بھی ان کا استعمال کیا گیا۔ حمیدی بیرکس پر متعین ایک ہزار فوجیوں کا زخمی ہونا انہی حملوں کی ایک کڑی تھا۔

والفجر - ۸ آپریشن

والفجر آپریشن (جو کہ ۹ فروری ۱۹۸۶ء کو شروع کیا گیا تھا) کے دوران عراقی حکومت کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال میں اپنے مذموم مقاصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ گزشتہ آپریشنوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اِس بار بھی عراق کی جانب سے کیمیائی ہتھیاروں کے شدید حملوں کی توقع تھی اور ایرانی دستوں کی جانب سے عراقی طیّاروں پر شدید فائرنگ کی گئی جس کے نتیجے میں ۸۰ کے قریب روسی اور فرانسیسی ساخت کے بمبار طیّارے گرا لیے گئے۔ گو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اِن میں سے کتنے طیّاروں کو فاؤ کے علاقہ میں کیمیائی بموں کے گرانے کی ہدایات دی گئی تھیں تاہم دستیاب ریکارڈ کے مطابق اِس سلسلے میں آٹھ مؤثر فضائی حملے کیے گئے جن میں سے صرف ایک حملہ فوجی دستوں کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو سکا جس کے نتیجے میں بدقسمتی سے کئی فوجی زخمی ہو گئے۔

۱۳ فروری ۱۹۸۶ء کے اِس حملے میں جو فاؤ اور بسورا کو ملانے والی سڑک پر کیا گیا۔ عراق نے کئی اقسام کے کیمیائی ہتھیار استعمال کیے جن میں مسٹرڈ، سیانائیڈ، اعصابی اور دورانِ خون کو متاثر کرنے والی زہریلی گیسیں شامل تھیں۔ یہاں پر بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ بعض فوجی ماہرین کے نزدیک فاؤ کے علاقہ میں کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کی وجہ سے عراقی حکومت کے اپنے کیمیائی ہتھیاروں کے ڈپو بھی متاثر ہوئے جس کی وجہ سے کئی عراقی فوجی دستوں کو کیمیائی ہتھیاروں کی ہلاکت آفرینیوں کا سامنا کرنا پڑا اور عراقی حکومت کو بھی اِس بات کا احساس ہوا کہ ان کے اپنے اِستعمال کردہ کیمیائی ہتھیار ان کو گزند پہنچا سکتے ہیں۔

کربلا - ۵ آپریشن

اِس آپریشن کے دوران عراق کی جانب سے کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کی شدّت اور نوعیت پوری طرح سامنے آئی۔ اِن حملوں میں شدّت جنوری ۱۹۸۷ء کے شروع میں دیکھنے میں آئی۔ ابھی کربلا - ۵ آپریشن شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ عراقی فضائیہ نے دس عدد مشنوں کی تکمیل کی جس میں مغربی سیکٹر کے ساتھ واقع پانچ آبادیوں پر آرٹلری کے ذریعے کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا گیا۔ کربلا آپریشن شروع کرنے کے بعد ۸ جنوری ۱۹۸۷ء سے ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ء کے درمیانی عرصہ میں تقریباً ۵۶ مرتبہ عراق نے کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ تاہم خوش قسمتی سے ایرانی فوجیوں کو زیادہ نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایرانی فوجی کیمیائی ہتھیاروں کے اثرات سے بچنے کے لیے پوری طرح تیار تھے اور انہیں اِس سلسلے میں پہلے ہی باقاعدہ ٹریننگ دے دی گئی تھی۔ اِس آپریشن کے دوران عراق نے عام ہتھیاروں کی طرح کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ تاہم اس کو اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی نہ ہوسکی۔

کربلا - ۵ کے علاقہ ہی میں جب بعدازاں کربلا - ۸ آپریشن شروع ہوا تو اس میں بھی عراق کی جانب سے کیمیائی ہتھیار استعمال ہوئے اور اس دوران بسورا اور خرم شہر کے شہروں پر کیمیائی حملے بھی کیے گئے۔

سردشت

جنگی محاذوں پر کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد میں ناکامی کے بعد عراقی حکومت نے شہری علاقوں پر کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال شروع کیا اور اِس سلسلے میں ۲۸ جولائی ۱۹۸۷ء کو سردشت شہر کے چار رہائشی علاقوں پر کیمیائی ہتھیاروں کے ذریعے چار حملے کیے۔ رہائشی و شہری علاقوں پر عراق کے اِن حملوں کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی

اور عراق کے اس اقدام پر پُوری دنیا میں خطرے اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ان کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کے بعد پُوری منصوبہ بندی اور ترتیب سے عراقی کردش علاقہ پر مسلسل کیمیائی ہتھیار استعمال کیے گئے اور اس ضمن میں ایران میں موجود کردش دیہاتیوں کو بھی کیمیائی ہتھیاروں کا نشانہ بنایا گیا۔ ان حملوں میں ۱۳۰ افراد کی جانیں ضائع ہوئیں اور ۸۰۰ سے زائد افراد شدید زخمی ہوئے اور ان میں عورتوں اور بچّوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

کردش علاقوں میں کیمیائی ہتھیار استعمال کی وجہ یہ تھی کہ عراقی حکومت کردوں کی گوریلا جنگ پر قابو پانے میں بُری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ چنانچہ عراقی حکومت کا خیال تھا کہ ان کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال سے وہ نہ صرف کردشوں کی بغاوت کو روک سکے گی بلکہ علاقہ میں خوف اور دہشت کی فضا قائم کر سکے گی تاکہ عراقی حکومت اور فوج کا دبدبہ طاری ہو سکے۔ عراق کی طرف سے ایران پر جنگ مسلط کرنے کے ابتدائی سالوں ہی میں عراقی حکومت نے ان علاقوں میں بسنے والے معصوم انسانوں کی زندگیوں سے کھیلنا شروع کر دیا تھا اور حکمران گروہ اس کو اپنا حق سمجھتا تھا کہ وہ ملکی استحکام اور بقا کی خاطر جس طرح کے چاہے، ہتھیار استعمال کر سکے۔ حلبچہ (HALABCHEH) شہر میں عراقیوں کی طرف سے کیا جانے والا ظلم و ستم عراقی حکومت کی وحشیانہ پالیسی کی انتہا تھی۔ وسط اپریل ۱۹۸۷ء میں عراقی حکومت نے بڑے پیمانے پر کیمیائی ہتھیاروں کے جس استعمال کو شروع کیا تھا اس کی چند مثالیں ذیل میں دی جا رہی ہیں۔

(۱) وسط اپریل ۱۹۸۷ء میں شمالی عراق میں واقع آٹھ کردش دیہاتوں پر عراقی فضائیہ نے کیمیائی ہتھیاروں سے حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ اس حملہ میں ایک ترک ٹیکنیشن جو کہ ترک کمپنی (ای این کے اے) کے لیے کام کرتا تھا، بُری طرح زخمی ہوا۔ ترکی کے اخبار روزنامہ حریت نے اس واقعہ کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ روزنامہ حریت کے مطابق یہ حملہ ۱۵ اپریل ۱۹۸۷ء کو کیا گیا اور زخمی ہونے والے ترک باشندے کا نام علی سلوی تھا۔

(۲) اُوپر بیان کردہ واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد کچھ اور دیہاتوں میں عراقی فوجیوں نے کیمیائی بم پھینکے۔ اِن علاقوں میں صوبہ اربیل کے مشرق میں واقع گاؤں بلیین، تمتیہ، شیخ حسن، بناکوکان اور مارگوئے اور صوبہ سلیمانیہ کے شمال میں واقع گاؤں نخذلر، گوکھکھ سانگڑ، باگلو، سرگالو اور حلام شامل تھے۔ اِس مرتبہ بھی بین الاقوامی میڈیا نے اِن حملوں پر رپورٹیں شائع کیں۔

برطانوی اخبار انڈیپینڈنٹ نے اِس مسئلہ پر لکھا:

"جب بھی بعث (BA'ATHIST) حکومت شدید دباؤ کا شکار ہوتی ہے۔ تب وہ انتہائی بہیمانہ انداز میں ردِّ عمل ظاہر کرتی ہے۔" اُوپر بیان کردہ حملہ میں ۱۳۵ افراد زخمی ہوئے جنہیں طبّی علاج کے لیے بختران (BAKHTARAN) بہامان ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ بعدازاں چند زخمی تہران پہنچے تاکہ وہ اچھی طرح اپنا علاج کرواسکیں۔ اِن زخمیوں نے بتایا کہ ۴ اپریل ۱۹۸۷ء کو ۱۲ عراقی جیٹ طیّاروں نے شگ لالی علاقوں کے کرد دیہاتوں میں چوبیس گھنٹوں میں ۱۸ کیمیائی بم گرائے۔ اِن حملوں پر برطانوی اخبار "گارڈین" نے فوجی ماہرین کے حوالے سے لکھا کہ "عراق کی طرف سے کرد اقلیت کے خلاف کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ ملک میں اِنسانی وسائل کم ہو چکے ہیں۔

(۳) ۲۸ جولائی کو عراقی کرد انتہاپسندوں نے عراقی کیمیائی ہتھیاروں کے ہاتھوں ہلاکت کا شکار ہونے والے کرد باشندوں کے نام اور رہائشی مقامات کی فہرست جاری کی۔

(۴) ستمبر ۱۹۸۷ء میں عراقی کردش محبِ وطن یونین نے یہ بیان جاری کیا کہ "۴ بجے کے قریب عراقی فوجوں نے غیر محفوظ کرد آبادی پر کیمیائی ہتھیاروں سے حملہ کیا ہے۔ اِس حملہ میں "مسٹرڈ گیس" کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا۔ اِس حملہ کی رپورٹیں سویڈش اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔ جن میں یہ مزید بتایا گیا کہ کیمیائی ہتھیاروں کا شکار ہونے والے دیہات سلیمانیہ سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع علاقوں پر مشتمل تھے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں فرانسیسی اخبار "لے مونڈے" نے عراق کی جانب سے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ قواعد و ضوابط کی کھلم کھلا خلاف ورزی اور شمالی کرد علاقوں میں کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال پر رپورٹیں شائع کیں۔

والفجر ۱۰ اور حالب چہ میں قتل عام

آپریشن والفجر کے شروع کرنے اور حالب چہ اور سلیمانیہ صوبہ میں کرد شہروں کی آزادی اور حد بندی کے خاتمے پر عراقی فوج اپنی شکست پر بلبلا اُٹھی اور اپنی شکست کے داغ کو دھونے کے لیے اس نے نہ صرف اسلامی فوج کے خلاف کیمیائی ہتھیار استعمال کیے بلکہ اپنے آزاد کردہ علاقہ پر واقع ڈسٹرکٹس پر بھی اُن کا استعمال کیا۔ معصوم لوگوں کے کھلے بندوں اس قتل عام کو موجودہ صدی کی بدترین بربریت قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ سانحہ کسی طرح بھی ہیروشیما اور ناگاساکی میں انسانی تباہی سے کم نہ تھا۔ اس بڑے آپریشن اور حالب چہ شہر کی مکمل آزادی کے بعد عراقی طیاروں نے ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ مارچ ۱۹۸۷ء کو حالب چہ پر مہلک ترین گیسوں (ہائیڈروجن سیانائیڈ) کا استعمال کیا جس کے نتیجے میں ۵ ہزار سے زائد افراد ہلاک اور ۷ ہزار سے زائد زخمی ہو گئے۔ اسی طرح سردشت کے علاقہ پر فضائی حملوں کے ذریعے کیمیائی گیسوں کا استعمال کیا گیا۔ ...ی فوجوں کی اس بہیمانہ کارروائیوں پر پوری دنیا کے پریس نے رپورٹیں شائع کیں اور ہزاروں کی تعداد میں ایسے فوٹوز اور سلائیڈز دکھائی گئیں جو کہ عراقی بربریت کا منہ کھولتا ثبوت تھیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے مختلف ٹی۔ وی اسٹیشنوں پر حالب چہ پر عراقی ظلم و ستم کی دستاویزی فلمیں دکھائی گئیں اور ان تمام اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ اس بہیمانہ جارحیت پر عالمی مزاحمت قائم کی جائے تا کہ لوگوں کی کھلے عام قتل و غارت کو روکا جا سکے۔ تاہم دنیا بھر میں اسکی مذمت کی گئی نگران کارروائیوں کے باوجود عالمی اداروں نے ایسے طریقے دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ جن کے ذریعے زہریلی گیسوں کے استعمال کی بدترین برائی سے بچا جا سکے۔

عراق کی جانب سے کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کا جو مواد اکٹھا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد عراق کے کیمیائی ہتھیاروں کے ذریعے حملوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کے پہلے ایام میں ان حملوں کی تعداد دس کے قریب تھی تاہم ۲۱ مارچ ۱۹۸۷ء تا ۲۰ مارچ ۱۹۸۸ء کے درمیانی عرصہ میں ان کی تعداد ۴۵ تک پہنچ گئی۔ عراق کی جانب سے اس قدر پیمانہ پر اور کھلے بندوں ان مہلک اور ممنوعہ ہتھیاروں کا استعمال عالم انسانیت کے اصولوں اور بین الاقوامی قانون کی کھلم کھلا خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ لیکن اس میں افسوسناک بات یہ ہے کہ عالمی اداروں نے عراق کو ان ہتھیاروں کے استعمال سے روکنے کی کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی۔

جہاں تک ان ہتھیاروں کے استعمال کے ذریعے ہونے والی اموات کا تعلق ہے، ۲۱ مارچ ۱۹۸۷ء سے ۲۰ مارچ ۱۹۸۸ء تک حالب چہہ کے علاقہ میں سب سے زیادہ اموات واقع ہوئیں۔ جبکہ ۲۱ مارچ ۱۹۸۵ء تا ۲۰ مارچ ۱۹۸۶ء کے درمیانی دور میں کیمیائی ہتھیاروں کے ذریعے واقع ہونے والی اموات دوسرے نمبر پر رہیں۔ ہر سال استعمال کیے جانے والے کیمیائی ہتھیاروں کے حملوں اور ان سے واقع ہونے والی اموات کے درمیان کوئی براہ راست تعلق موجود نہیں ہے۔ اس کی وجوہات میں ان ہتھیاروں کے استعمال کی عدم صلاحیت، ان کا سنجیدہ اور مؤثر دفاع، موسمی حالات اور حملوں کے لیے منتخب کردہ زمینوں کی ساخت شامل ہے تاہم تمام تر دفاعی قوت استعمال کرنے کے باوجود ان ہتھیاروں کے ذریعے ہونے والی اموات پچھلے چند سالوں میں تیزی سے بڑھتی رہیں، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ۲۱ مارچ ۱۹۸۰ء تا ۲۰ مارچ ۱۹۸۱ء کے درمیانی عرصہ میں اگر اموات صفر تھیں تو ۱۹۸۷ء تک یہ ۱۲۰۰۰ تک پہنچ گئیں۔ اموات اور زخمیوں کی تعداد میں اس اضافہ کی اصل وجہ شہری آبادیوں پر کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال تھا۔ جن میں سردشت اور حالب چہہ سرفہرست ہیں۔

پچھلے چند سالوں کے دوران عراقی فوج مختلف اقسام کے کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے کی کوشش

کرتی رہی ہے جن میں مسٹرڈ گیس نروگیس (اعصابی گیس) سیانائیڈ فاسفورس اسفیکسی ایٹنگ (PHOSPHORUS ASPHYXIATING) اور نازٹینگ گیس شامل تھیں۔

نصف کے قریب حملوں میں مسٹرڈ اور نائٹروجن مسٹرڈ گیس استعمال کی گئی۔ ایک چوتھائی حملوں میں نروگیس (اعصابی گیس) استعمال کی گئی اور ایک ہشتم حملوں میں سیانائیڈ گیسیں استعمال کی گئیں جن میں ہائیڈروجن سیانائیڈ کا استعمال سب سے زیادہ تھا۔

کیمیائی ہتھیاروں کے ذریعے حملوں میں زہریلی گیسوں کے استعمال میں زیادہ تر فضائی طیارے استعمال کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ آرٹلری اور راکٹ لانچروں کے مقابلے میں طیاروں کے ذریعے زیادہ ایمونیشن لایا جا سکتا تھا اور یہ کہ طیاروں کے ذریعے گیسوں کو دشمن کے اگلے مورچوں سے لے کر شہری آبادی تک آسانی سے پھیلایا جا سکتا تھا۔

شہروں کی جنگ کے چوتھے راؤنڈ میں میزائل بڑے پیمانے پر استعمال کیے گئے جس کی وجہ سے کیمیکلز، مائیکروبک اور ریڈیو ایکٹو ایجنٹس کی بہم رسانی خصوصی توجہ کی متقاضی ہونی چاہیئے۔ جنگ کے دوران عراق کی جانب سے دو تہائی کے قریب کیمیائی ہتھیاروں کے حملے فضائی ذریعوں سے کیے گئے جبکہ راکٹ لانچرز اور آرٹلری کے ذریعے کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال ایک تہائی کے قریب رہا۔ ویسے بھی موجودہ زمانے میں راکٹ لانچروں کے ذریعے کیمیائی اسلحہ کا استعمال بہت کم ہے۔

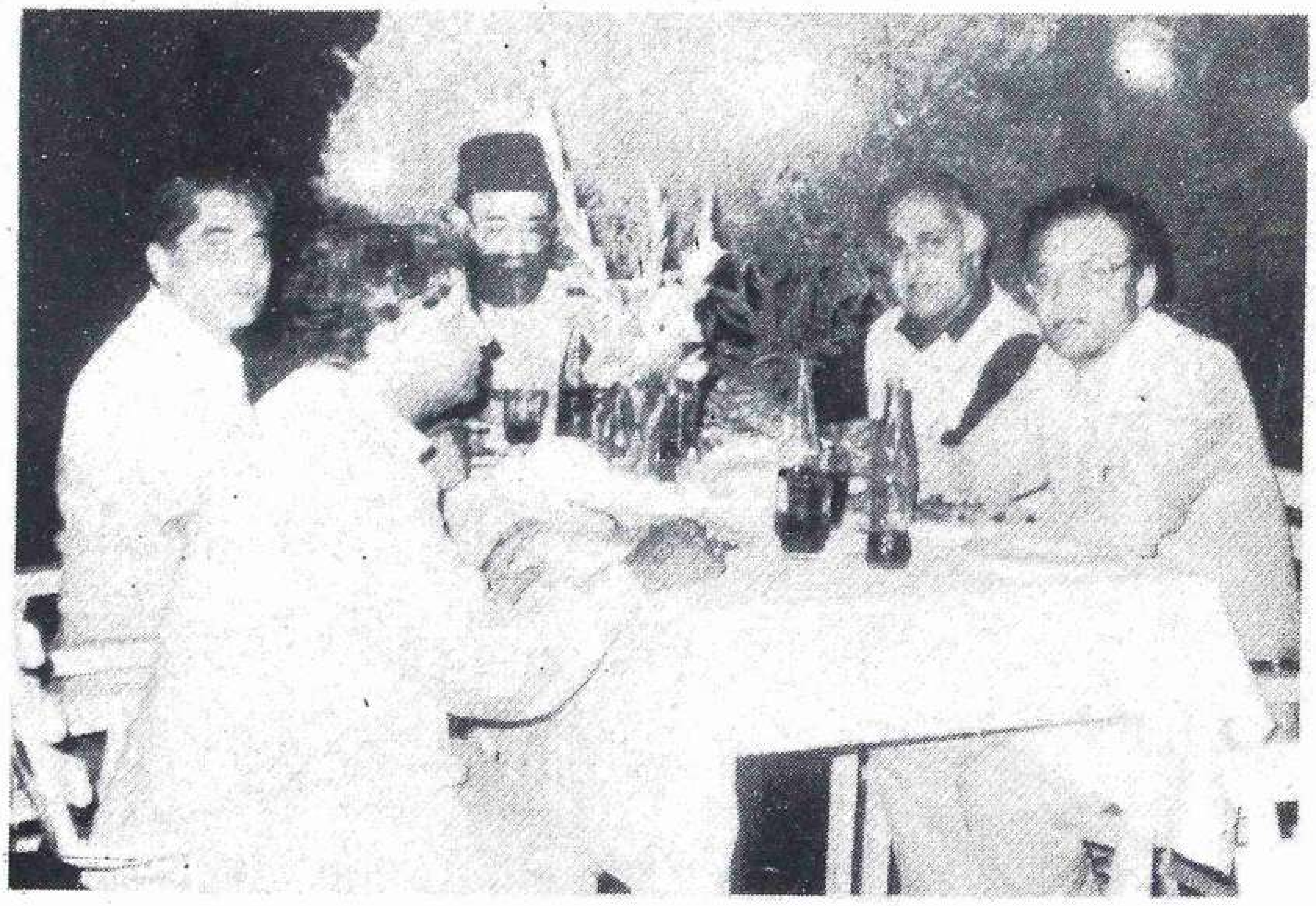

بینک ملّی ایران کے عشائیے میں ڈاکٹر حسنات، کرنل مہدی، آغا بویا، افضل حیدر، افضال شاہد

شہر طباعت کی سیر

جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ ہو چکا ہے کہ ایرانیوں کا ملنے کا انداز بڑا والہانہ ہے، بڑے پُرجوش انداز میں معانقہ کرتے ہیں۔ گال سے گال ملاتے ہیں اور محبت کا اظہار کچھ زیادہ ہی مقصود ہو تو منہ چومنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مَیں بھی اپنے قیام کے دوران جس شخص کی محبت میں گرفتار رہا وہ صرف بُوصراف تھا۔ ہوٹل کی لابی میں، کانفرنس ہال میں، ہوٹل کے لان میں، جہاں کہیں بھی جس سے ملاقات ہوتی وہ سب سے پہلے ایک ہی سوال کرتا۔ ANY PROBLEMS اور میں اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ میں دے کر صرف اِتنا کہتا:

YES I HAVE FALLEN IN LOVE WITH YOU

اور وہ قہقہہ لگا کر مجھے گلے سے لگا لیتا۔ وہ خاص طور پر پاکستانی مندوبین سے یہ سوال ضرور کرتا۔ یہ اس کی منصبی ذمّہ داری بھی تھی اور وہ چونکہ خود بھی اسلام آباد میں مقیم تھا اس لیے ہمارا زیادہ خیال رکھنا فطری بات تھی۔ ایک روز اس کی پریشانی دیکھ کر میں خود بھی پریشان ہوا۔ پتہ چلا کہ اس کا بچّہ بیمار ہے اور اسے ۱۰۵ درجے تک بخار ہے جس کی وجہ سے نوبت ہسپتال تک آپہنچی ہے دو روز حسن خاصا پریشان رہا اور بالآخر اس کی پریشانی دُور ہو گئی۔ بچّہ صحت مند ہو کر گھر آ گیا تھا۔

ارنا کے ڈائریکٹر جنرل اور وار ہیڈ کوارٹر انفارمیشن سنٹر کے سربراہ ڈاکٹر کمال اور مسٹر رجاوی کیسا تھ

کانفرنس جاری تھی، میں انٹرنیشنل لا کمیٹی کے اجلاس میں بیٹھا تھا۔ جس کی وائس چیئرمین کی کرسی پر اپنے ڈاکٹر سید فاروق حسنات احمد جلوہ افروز تھے۔ برطانوی مندوب مسز الزبتھ اپنا مقالہ پڑھ رہی تھیں کہ حسن اجلاس میں آیا اور میرے کان میں باہر آنے کا کہا۔ باہر نکلا تو حسن حسبِ معمول سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا، حسن کچھ اس بے تحاشا انداز میں سگریٹ نوشی کرتا ہے کہ مجھے ایک مرتبہ اسے کہنا پڑا:

HASAN, YOU DONT SMOKE CIG, YOU EAT THEM,

YOU DRINK THEM AND WHAT NOT

اور وہ ہمیشہ میری اس بات پر حسبِ عادت مسکرا دیا۔ حسن کہنے لگا۔ ہوٹل کے پورچ میں گاڑی آپ کے انتظار میں ہے۔ ہم چند صحافیوں کو ایران کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے کی سیر کے لیے لے جا رہے ہیں۔ یہ آپ کے لیے اچھا موقع ہے۔ آپ بھی دیکھیں ہمارے ہاں اخبار کیسے چھپتا ہے، مشینری کیسی اور ورکنگ کنڈیشنز کیسی ہیں۔ میرے لیے یقینی طور پر یہ بات بڑی اہم تھی۔ میں نے فوراً اپنا بستہ سنبھالا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جرمن ڈی کے شولاتور اور الجزائر کے قومی روزنامے کے ایڈیٹر اپنی بیگم سمیت گاڑی میں موجود تھے۔

کرنل غفار مہدی بھی آن ملے اور مجھے گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر کہنے لگے۔ میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ افضال کہاں ہے، اُسے بھی ہمارے ساتھ ہونا چاہیئے۔ گاڑی کے آگے حسبِ معمول دو پائلٹ چل رہے تھے۔ گاڑی تہران کی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی ایک بلند و بالا عمارت کے سامنے جا رُکی جس پر "روزنامہ اطلاعات" بڑے جلی حروف میں آویزاں تھا۔ اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے مجھے قطعاً اِس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ہم کسی اخبار کے دفتر کے بجائے "شہرِ طباعت" میں داخل ہو رہے ہیں۔ استقبالیہ پر کارکنوں نے ہمارا استقبال کیا اور پھر ہم لفٹ کے ذریعے پہلے فلور پر پہنچے یہاں ایک اور عظیم شخصیت سے ہماری ملاقات ہوئی یہ حجۃ الاسلام محمود دوا آئی تھے جن کا شمار امام خمینی کے معتمدان خاص میں ہوتا ہے۔ یہ بھی پیرس

سے امام خمینی کے ساتھ ایران آئے تھے اور آج کل ایران کے اس قومی روزنامے اور پبلیکیشن ہاؤس کے سربراہ ہیں۔ میری بے چینی اب اس حوالے سے قابلِ دید تھی کہ میرے پاس کیمرہ تو تھا مگر کوشش بسیار کے باوجود مجھے فلم میسر نہیں آرہی تھی۔ یہاں ایک خاتون مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ اُن سے درخواست کی کہ یہ تو روزنامے کا دفتر ہے۔ ایک آدھ فلم ہی کا بندوبست کردیں۔ اُنہوں نے کہا کہ رنگین فلم کا ملنا تو مشکل ہے تاہم بلیک اینڈ وائٹ رول کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ میں نے اسی پر آمنّا و صدّقنا کہا اور جلدی جلدی فلم کیمرے میں ڈالی۔ ہم میٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ جہاں اخبار کا سینیئر عملہ بھی موجود تھا۔ یہاں مسٹر حبیبی سے بھی ملاقات ہوئی جو کمپیوٹر سیکشن کے انچارج تھے۔ اُنہوں نے جرمنی اور جاپان سمیت بہت سے ملکوں سے تربیت حاصل کی تھی اور لیزر کامپ کمپیوٹر اور دیگر جدید مشینری کے بارے میں خاصی معلومات کرسکتے تھے۔ یہاں ہم سب نے باری باری اپنا تعارف حجۃ الاسلام محمود دوائی سے کرایا۔ اُنہوں نے روایتی ایرانی مسکراہٹوں کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہم آج ان کے مہمان تھے۔ روزنامہ اطلاعات ایران کا سب سے بڑا روزنامہ ہے جو ہر شام لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ اس عمارت میں ۲۰ کے قریب ہفت روزے، پندرہ روزے اور ماہنامے باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں جن میں خواتین، سپورٹس، بچّوں اور دیگر سماجی موضوعات پر شائع ہونے والے جریدے بھی شامل ہیں۔ ان ۲۰ جریدوں کی اشاعت کے لیے الگ الگ شعبے قائم ہیں اور روزنامہ "اطلاعات" کی اس ۶ منزلہ عمارت میں پرنٹنگ پریس سے لے کر کمپیوٹر، ریفرنس، کتابت، آرٹ سیکشن، اغلاط سیکشن اور ماسکنگ روم تک الگ الگ موجود ہیں جہاں تقریباً ۱۲۰۰ افراد کا عملہ دن رات طباعت کے ان مختلف مراحل کو طے کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ مسٹر حبیبی کے ساتھ جب کمپیوٹر کے بارے میں معلومات کا تبادلہ ہوا تو وہ پاکستان میں حال ہی میں رواج پانے والے اخباری طباعتی نظام کے بارے میں جاننے کے لیے بڑے بے چین تھے

حجتہ الاسلام محمود دوآئی کے ساتھ گفتگو کے بعد ہمیں مختلف شعبوں کو دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ کمپیوٹر سیکشن میرے لیے سب سے زیادہ توجہ کا باعث تھا۔ وہاں خواتین اور مردوں کی ایک بڑی تعداد خبریں ٹائپ کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی فلم بن رہی تھی۔ یہ کمپیوٹر کا لائنوٹائپ سسٹم تھا اور ساتھ ہی ساتھ اغلاط بھی لگ رہی تھیں۔

میں نے جب پرنٹنگ کے سسٹم کے بارے میں ان لوگوں سے معلومات کا تبادلہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ حبیبی میری باتوں سے خاصا متاثر تھا اور پاکستان میں اس نظام کے بارے میں مجھ سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اس عمارت میں طباعت کا کام قدیم و جدید کا ایک دلچسپ سنگم ہے۔ ایک جانب کمپیوٹر ہے تو دوسری طرف کمپوزنگ ہال بھی خاصا طویل ہے۔ جس میں ٹیکنیکل ٹائپ سیٹنگ کا نظام ہے۔ ایک طرف کمپیوٹر برومائیڈ اور پازیٹو نکال رہا ہے تو دوسری طرف دھات کو ڈھال کر پلیٹ بھی بن رہی ہے۔ میں نے ایک بات پر خاصی حیرت کا اظہار کیا کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود یہ لوگ ابھی تک سکینر سے استفادہ نہیں کر رہے تھے اور ایک بہت بڑے ہال میں آرٹسٹوں کی ایک بڑی تعداد رنگین تصاویر کے پازیٹوز کی ماسکنگ میں مصروف تھی۔ میرے لیے ایک اور دلچسپ جگہ ریفرنس سیکشن تھی۔ میں نے جب اپنے ہاں کے ریفرنس سیکشن کا مقابلہ اس کے ساتھ کیا تو شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ یہ ریفرنس سیکشن اتنا بھرپور اور اپ ٹو ڈیٹ تھا کہ آپ سیاست، تاریخ، فلسفہ، قیادت کسی بھی قسم کا ریفرنس پوچھنا چاہیں، ایک منٹ میں وہ فائل آپ کے سامنے ہوگی۔ مجلد اخبارات اور ریفرنس شیٹوں کو بڑے سلیقے سے الماریوں میں رکھا گیا تھا۔

آرٹ سیکشن میں ایک بار پھر میری نظر دیوار پر لگے حضرت علیؑ کے پورٹریٹ پر پڑی۔ میں نے ایک آرٹسٹ سے پوچھا کہ بھائی یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ پورٹریٹ آپ کے ہاتھ کہاں سے لگا اور یہ ہر جگہ کیسے موجود ہے۔ کچھ اس کے ماخذ کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔ اس آرٹسٹ کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ ایک تخیلاتی تصویر ہے جو تقریباً نصف صدی پہلے ایران کی ایک خاتون

آرٹسٹ نے بنائی تھی اور یہ پورٹریٹ اتنا دلکش، جامع اور متاثر کن تھا کہ اسے میوزیم میں رکھوا دیا گیا اور آپ مختلف جگہوں پر جو تصاویر دیکھتے ہیں یہ اس پورٹریٹ کی کاپیاں ہیں اصل تصویر میوزیم ہی میں ہے۔ لوگوں نے ذہنی طور پر اسے قبول کرلیا ہے اور یہ امام علیؑ کے ساتھ اُن کی عقیدت اور محبت کا اظہار ہے کہ وہ اس تصویر کو اپنے گھروں میں لگانا باعثِ برکت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف ایک فنکار کا تخیل ہے۔ حقیقی شبیہہ کو کینوس پر منتقل کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ تاریخ اسلام کی مقدس شخصیات کی تصاویر ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئیں حالانکہ پڑھا ہے اور سُنا ہے کہ اُس دور میں بھی بڑے بڑے ماہر بُت گر اور مصوّر اس دھرتی پر موجود تھے مگر شاید کسی نے اس طرف دھیان نہیں دیا یا پھر کسی کی جراٴت نہیں ہوئی کہ ایسا کرسکے۔

آج تک حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے لے کر تاریخ اسلام کے جن سپہ سالاروں کی تصاویر بھی ہم تک پہنچی ہیں وہ سب مصوّروں کا اپنا تخیّل ہے تاہم کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تصویر حقیقت کے بے حد قریب ہے۔ وقت بہت کم تھا اور عمارت بڑی طویل و عریض۔ ایک دو گھنٹے میں پُوری عمارت کی سیر اور ہر شعبے کا مطالعہ ناممکن تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مناظر عکس بند کرلوں۔ لفٹ ایک منزل سے دوسری کا فاصلہ تیزی سے طے کر رہی تھی اور ایک مقام پر جب ہم لفٹ پر سوار ہونے لگے اور حجۃ الاسلام محمود دوائی بھی ہمارے ساتھ تھے تو میں نے دیکھا کہ سیاہیوں سے بھرے ہوئے لباس والے دو تین مشین مین بھی اسی لفٹ میں بلا جھجک آ گئے اور السلام علیکم کہہ کر ہمارے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ حجۃ الاسلام نے مسکرا کر اُن کے سلام کا جواب دیا تھا اور مجھے اپنے ہاں کی لفٹ یاد آگئی۔ جو اوّل تو کھُلتی نہیں اور صرف خاص موقعوں اور خاص مہمانوں کے لیے کھولی جاتی ہے اور اگر کبھی کھُل بھی جائے تو اس میں صرف "اَن داتا" یا بڑے افسر ہی سوار ہو سکتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ گراؤنڈ فلور سے سو کے قریب کُرسیاں چوتھے فلور پر پہنچانا مقصود تھیں، مَیں نے مینجر صاحب سے کہا کہ چپراسی اور صفائی والے دو دو کرسیاں

اُٹھا کر چوتھی منزل تک لے جا رہے ہیں۔ آپ لفٹ چلوا دیں۔ اس طرح ایک طرف تو بے چاروں کی مشقت کم ہوگی اور دوسری طرف تھوڑے وقت میں کام ہو جائے گا تو مینجر صاحب نے جواب دیا تھا رہنے دیجئے جناب یہ پیدا ہی اس کام کے لیے ہوئے ہیں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ فنکشن بھی میں اچھی طرح نہیں کر پایا تھا اور اس رات شاید میں نے معمول سے تین گنا زیادہ سگریٹ بھی پیئے تھے (خدا عظیم ہے)

روزنامہ "اطلاعات" کے دفاتر کی سیر کرتے ہوئے مجھے بارہا یہ خیال آیا تھا کہ یہاں ہونے والے کام، کارکنوں کے کام کے انداز، انتظامیہ کے رویّے اور پروڈکشن کے بارے میں جامع رپورٹ مرتب کرنے کے لیے کم سے کم ایک ہفتے کا وقت درکار ہے پریس میں پہنچے تو مشینوں کا شور ہمارا منتظر تھا۔ ہمارے ہاں جو مشینیں نصب ہیں ان کا خاصا یہ ہے کہ وہ پرچہ فولڈ کر کے آخری پلیٹ والے رولر کے ساتھ ہی ڈھیر لگائی جاتی ہیں جنہیں ایک کارکن اُٹھا کر تہ در تہ رکھتا چلا جاتا ہے مگر یہاں نظارہ کچھ اور تھا۔ ایک طویل چین تھی جو چھت کے ساتھ لٹکتی ہوئی ہال کے دوسرے حصے تک چلی گئی تھی۔ مشین کے آخری رولر سے بائینڈنگ سیکشن تک کا تازہ ترین اخبار کا یہ سفر بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ مشین مین اور مکینک ہر لمحہ مشینوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ کوئی رفتار کو چیک کر رہا تھا اور کوئی طباعت کی کوالٹی کو اور یہ سلسلہ تیزی سے جاری تھا۔ یہ وہ اخبار تھا جسے دو گھنٹے کے بعد مارکیٹ میں آنا تھا۔ پرنٹنگ ہال سے نکلے تو پُر تکلف کھانے کی دعوت ہماری منتظر تھی۔ بلڈنگ کی آخری منزل پر ایک شاندار ریسٹورنٹ بنایا گیا ہے۔ جس کے وسیع ہال میں کھانا سرو کیا گیا۔ مسٹر حبیبی یہاں بھی میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے اور کھانے کے ساتھ ساتھ بات چیت بھی چل رہی تھی۔ وہ پاکستان آ کر پرنٹنگ کا نظام دیکھنے کے بھی خواہش مند تھے۔

اُنہوں نے نظامِ کار کے بارے میں بتایا کہ یہاں ہر کارکن کو زندگی کی تمام سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں اور چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہیں۔ سب کارکن ہیں، محنت کش ہیں، کوئی حکم کا

مزدور ہے تو کوئی ہنر کا۔ ہم سب ایک بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انقلاب کی بنیادیں مضبوط بنانے میں ذرائع ابلاغ کا بڑا واضح کردار ہے اور ہم اپنے فیلڈ میں یہ کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں "آپ نے ہمارا ٹی وی دیکھا" انہوں نے پوچھا "ہاں! دیکھا ہے خاصا خشک ہے۔ اناؤنسر ایک ہی ہے جس کے اگلے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں اور روزانہ وہی ٹی وی پر دکھائی دیتا ہے"۔ میں نے کہا: اس پر مسٹر حبیبی ہنس دیئے اور کہنے لگے "آج ایک ڈرامہ چلے گا ضرور دیکھیئے گا، پھر آپ کو خشکی کی شکایت نہیں رہے گی۔ ہم صرف مذہبی پروگرام ہی نہیں دکھاتے، تفریح بھی ہوتی ہے، معلوماتِ عامہ بھی، بس ہمارا ٹی وی مادر پدر آزاد نہیں ہے "چند اخلاقی ضابطے ہیں جن کا ہر اسلامی معاشرے میں احترام ہونا چاہیئے"۔ روزنامہ "اطلاعات" کے دفاتر سے روانہ ہوتے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہم نے جو انقلاب کتابوں میں پڑھا وہ ایسا تو نہیں ہوتا، ایک انجنیئر کی سوچ بھی وہی ہے جو قم کی علمی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل عالمِ دین کی ہے۔ سوچ کی یہی یک رنگی قوموں کو آگے لے جاتی ہے۔ ۱۱ برس ہمارے ہاں بھی اسلام کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ شراب پر سرکاری طور پر پابندی ہے مگر ایک چوتھائی شہرات کو شراب پی کر سوتا ہے، کلب بند ہیں مگر عالیشان بنگلوں میں یہ محفلیں روز سجتی ہیں، عصمت فروشی جُرم ہے مگر بازارِ حُسن میں لائسنس یافتہ طوائفیں ہر رات ایک عالم کو دیوانہ بنانے کے لیے جسم سجا کر بالکونیوں میں موجود ہوتی ہیں، جہیز کا آرڈی ننس موجود ہے مگر آج بھی لاکھوں بیٹیاں اسکی وجہ سے ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔ زکوٰۃ کٹوانا قانونی طور پر لازم ہے مگر ہر سال جون کے مہینے میں لاکھوں اکاؤنٹ ہولڈر شیعہ ہونے کا حلف نامہ داخل کر کے اس قانون کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ کاش ہم بھی اس دو رنگی سے جان چھڑا لیں اور یک رنگی اختیار کر لیں مگر شاید ایسا کرنے کے لیے ہمیں بھی ایک خمینی درکار ہے لیکن مجھے نہ جانے اِس بات کا یقین کیوں ہے کہ

ہمارے ہاں بھی خمینی ضرور پیدا ہو گا۔ ہم میں بھی من حیث القوم یک رنگی ضرور آئے گی۔

ہمارے مزاج بھی ضرور بدلیں گے۔ ہوٹل کے کمرے میں اب مجھے اِس ڈرامے کا انتظار تھا، جس کے بارے میں مسٹر حبیبی نے بتایا تھا۔ ڈرامہ شروع ہوا تو زبان پوری طرح سمجھ میں نہ آنے کے باوجود مَیں اس سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ڈرامہ نام ہی کردار نگاری کا ہے اور اس میں کھڑا عاشق سٹائل ایک کردار ایسا تھا جس کی اداکاری دیکھ کر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈرامے کے تمام خاتون کردار اسی قومی لباس میں تھے جو یہاں ہر خاتون نے زیب تن کیا ہوتا ہے۔

بات شہرِ طباعت کی سیر کی چلی تو یہاں ایک ایسے اخبار کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جو ایران میں تو شائع نہیں ہوتا مگر انقلاب ایران کا داعی اور اسلام کا پرچارک ہے۔ یہ اخبار انگریزی میں ہے۔ اس کا نام کریسنٹ انٹرنیشنل ہے اور ہر پندرہ روز بعد "اونٹاریو" کینیڈا سے شائع ہوتا ہے۔ اخبار کا یکم سے ۱۵ر اگست کا شمارہ میرے کمرے میں موجود تھا اس کے ایڈیٹر ظفر بنگش ہیں جبکہ مینجنگ ایڈیٹر لطیف اویسی ہیں۔ اس شمارے میں ایران عراق جنگ بند ہونے کے بارے میں اداریہ اور امام خمینی کا جنگ ختم کرنے کا حکم نامہ شامل تھا۔ امام نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ جنگ بند کر دی جائے مگر دنیا کو اِسلام کی عظمت سے متعارف کروانے کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اس شمارے میں فلسطین، افغانستان، لبنان، پاکستان، بھارت اور ترکی کے علاوہ دیگر ممالک کے بارے میں بھی شامل تھیں۔ پاکستان میں چار فلسطینی ہائی جیکروں کی سزائے موت کی خبریں شامل تھیں اور جنرل ضیاٗ الحق کی تصویر کے ساتھ ۱۶ر نومبر کو انتخابات کے اعلان اور خود انتخابات میں حصہ نہ لینے کے اعلان کی خبر بھی شائع کی گئی تھی۔

اس کے علاوہ مولانا مودودی اور حسن البنا کی تصاویر کے ساتھ ایک تجزیاتی رپورٹ اور امریکہ میں معروف سیٹل سکینڈل میں ملوّث پاکستانی ارشد پرویز کو امریکی عدالت سے ملنے والی سزا کے حوالے سے بھی ایک مضمون شائع کیا گیا تھا۔ جس میں امریکی انصاف کی دھجیاں اُڑائی گئی تھیں

آج کانفرنس کے اختتام پر جہاں کانفرنس کے منتظمین خوش و خرم تھے وہاں مندوبین بھی خاصے مطمئن تھے۔ آج کا اہم ترین موضوع بھی عراق ایران جنگ کا خاتمہ تھا۔ اب جنگ بندی

کی حتمی تاریخ کا اعلان ہونا باقی تھا۔ جس کا اعلان عالمی ادارے کی جانب سے ہونا تھا تاہم یہ بات سب کے لیے خوش آئند تھی کہ اس طویل جنگ کا خاتمہ اس وقت ہوا جب وہ اس ضمن میں ہونے والی ایک عالمی کانفرنس میں موجود تھے۔ ہوٹل کی لابی میں ایران ائیر کا ہنگامی کاؤنٹر لگ چکا تھا، جہاں مندوبین کی واپسی کی فلائٹس کنفرم کی جا رہی تھیں اور دیگر معلومات فراہم کی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مشہد کے لیے ٹکٹ خریدا اور فلائٹ کنفرم کرائی۔ یہ ٹکٹ تہران، مشہد، تہران تیرہ ہزار ایرانی ریال یعنی ۱۳۰۰ تومان میں ملا۔ اب خبر یہ تھی کہ اگلے روز ہمیں سرکاری طور پر اصفہان لے جایا جا رہا تھا۔ بہت سے مندوبین کی خواہش تھی کہ سرحدی علاقوں کی سیر بھی کرائی جائے۔ ہمارے کوآرڈینیٹر مسٹر رجوائی بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں تاہم اصفہان جا کر اس بات کا حتمی فیصلہ ہوگا آپ لوگ مطمئن رہیں۔

زندہ رُود

آج کانفرنس کے مندوبین بھی خاصے مطمئن تھے، طویل میٹنگوں اور طویل مقالوں کی سماعت کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ مندوبین مختلف ٹکڑیوں میں بٹے لابی، ریسٹورانٹ اور کافی شاپ میں بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔ موضوعات وہی تھے، عراق ایران جنگ، جنگ بندی کے بعد ایران کی اقتصادی حالت، امریکہ کا کردار، ایرانی قوم اور کانفرنس کی رُوداد وغیرہ وغیرہ۔ زیدی صاحب حسبِ معمول کافی شاپ میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور اُن کی گرجدار آواز لابی تک سنائی دے رہی تھی۔ کانفرنس کے دوران میری سب سے پسندیدہ محفل یہی رہی تھی جسے زیدی صاحب کی موجودگی ہمیشہ "زندہ" رکھتی۔ امریکہ دشمنی زیدی صاحب کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ بات کسی بھی حوالے سے ہو رہی ہو اُنھوں نے امریکی سامراج کو کسی نہ کسی طرح تنقید کا نشانہ ضرور بنانا ہوتا ہے۔ مگر لُطف کی بات یہ ہے کہ اُن کی تنقید ہمیشہ مدلل اور پُراثر ہوتی ہے۔ آج بھی یہی سلسلہ تھا۔ وہ کسی امریکی سینیٹر کی بیوی کا قصہ سنا رہے تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ اُنھیں ایک دعوت میں ایک امریکی سینیٹر کی بیوی سے گفتگو کا "شرف" حاصل ہوا۔ خاتون برِصغیر اور خاص طور پر پاکستان کے بارے میں خاصی متفکر تھیں۔ اُنھوں نے گفتگو کرتے ہوئے پوچھا "مسٹر زیدی آپ کے ملک میں روٹی ہوتی ہے" اس پر زیدی صاحب نے ہنستے ہوئے

کہا " جی نہیں وہاں لوگ گھاس کھاتے ہیں " وہ حیرت سے بولیں " کیا آپ کے ہاں مکھن ہوتا ہے " زیدی صاحب نے پھر جواب دیا " جی نہیں وہاں لوگ درختوں کے پتوں پر گزارا کرتے ہیں " اور پھر زیدی صاحب نے غصے میں آکر جو فقرہ امریکی خاتون کے گوش گزار کیا وہ اُن کی طبیعت بحال کرنے کے لیے کافی تھا۔ زیدی صاحب نے کہا " میڈم ہم اُس وقت بھی ایک شاندار تاریخ رکھتے تھے جب آپ کے ملک کا ابھی جغرافیہ بھی نہیں بنا تھا " زیدی صاحب کی اِس بات کا سب نے لطف لیا۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ کانفرنس کے منتظمین نے ایک خوش خبری سنائی۔ کل صبح ہمیں اصفہان کی سیر کو لے جایا جا رہا تھا۔ اصفہان ایران کے تاریخی شہروں میں سے ہے اور اسے ثقافت اور فن کا گہوارہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حسنات کا کہنا تھا کہ فقط اصفہان دیکھنے کا کیا فائدہ ہمیں سرحدی علاقے بھی دکھائے جائیں۔ محاذِ جنگ کی سیر کرائی جائے تاکہ کچھ اندازہ اس بات کا بھی ہو کہ پیکار کا انداز کیا ہے۔ ہم لوگ خاص طور پر خرم شہر دیکھنا چاہتے تھے جس نے عراق ایران جنگ کے حوالے سے پُوری دنیا میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ہمارے اصرار پر کانفرنس کے مندوبین اس انتظام میں لگ گئے۔

دراصل خرم شہر، اہواز اور دیگر علاقوں میں جانے کے لیے فوجی حکام سے اجازت اور کوآرڈی نیشن ضروری تھا۔ اور منتظمین اِس چکر میں مصروف تھے اور پھر جب اس بات کا اعلان ہوا کہ اصفہان سے ہمیں سرحدی علاقوں میں بھی لے جایا جائے گا تو ہمارے چہروں کی رونقوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اَب ہماری منزل اصفہان تھی۔ ہمیں صبح کا وقت دے دیا گیا۔ لابی میں ایران ائیر کے کاؤنٹر سے تمام معلومات میسّر تھیں۔ اگلے روز علی الصبح ہمیں اصفہان کے لیے روانہ ہونا تھا، اور پھر وہاں سے خرم شہر اور اہواز وغیرہ اور یوں دو روز بعد تہران واپسی تھی۔ سب نے ایک دوسرے کو بروقت جگانے کی درخواست کی۔ طے یہ پایا کہ جو بھی پہلے بیدار ہو سب کے دروازے کھٹکھٹا دے۔ یہ فارمولا سیّد صاحب پہلے بھی استعمال کر چکے تھے اور خاصا مفید رہا تھا

کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد میرا ارادہ چونکہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کا بھی تھا اس لیے ضروری تھا کہ اِس ضمن میں بھی تمام معلومات حاصل کی جائیں اور یہ پروگرام اس طرح بنایا جائے کہ اگلے منگل کی تہران، کراچی، بمبئی والی فلائیٹ بھی ہاتھ آجائے۔ جی تو چاہتا تھا کہ ویزہ کی معیاد بڑھوا کر کم سے کم ایک دو ماہ اور ایران میں قیام کیا جائے اور اس خوبصورت سرزمین کا چپہ چپہ گھوما جائے۔ بغیر کسی گائیڈ اور مترجم کے مگر اِدھر چھٹی کا معاملہ گڑبڑ تھا۔ یُوں تو اب میری نوکریاں چھوڑنے کی سلور جوبلی ہونے والی ہے اور ہر مرتبہ اس احساس کے پیشِ نظر نوکری چھوڑی کہ یہ بھی غلامی کا ایک طوق ہے جس کا بوجھ کبھی کبھی برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ یوں ایک بار پھر یہ احساس بیدار ہوا اور اس سے پہلے کہ یہ پُوری طرح جاگ کر سلور جوبلی کے مکمل ہونے کا اعلان کرتا مَیں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ایران ایئر کے کاؤنٹر پر بیٹھے سمارٹ سے نوجوان کا سر کھانے لگا۔ اسی کاؤنٹر پر علی نامی ایک فربہ سا نوجوان بھی تھا۔ پہلے پہل تو مَیں یہ سمجھا کہ اس نے انگریزی نہ سمجھنے کا بہانہ کر رکھا ہے تاکہ مندوبین کے اُلٹے سیدھے سوالات اور بار بار پرواز بدلنے کے جھنجھٹ سے چھٹکارا ملے مگر جب وہ ایک دو مرتبہ کرنل غفار مہدی صاحب سے جھڑکیاں بھی کھا چکا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اسے واقعی فارسی کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی۔ اس کی ڈیوٹی ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ وہ ساز و سامان کا بھی حساب رکھتا، بورڈنگ کارڈ اور دیگر معاملات کو بھی دیکھتا اور اس کے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کئی راتوں سے اپنی نیند پوری نہیں کر سکا۔

مشہد کا پروگرام بناتے ہوئے معلوم ہوا کہ تہران سے ریل گاڑی بھی جاتی ہے اور ایران ایئر کی روزانہ پرواز بھی ہے۔ تہران میں ٹیوب سٹیشن بھی ہے جس کا نظارہ مَیں روزنامہ اطلاعات" کی چھت سے کر چکا تھا۔ گاڑی تقریباً چوبیس گھنٹے میں سمندر کے کنارے کنارے بھاگتی ہوئی تہران سے مشہد پہنچتی ہے اور یہ سارا علاقہ سرسبز و شاداب ہے اور دیکھنے کے لائق بھی مگر وقت کی کمی کے پیشِ نظر جہاز ہی کے سفر کو ترجیح دینا پڑی۔ اب احساس ہو رہا تھا کہ سیاح زمینی سفر کو

ہوائی سفر پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ واپسی کے پروگرام کو ذہن میں رکھ کر دو روز بعد کی ٹکٹ کنفرم کرائی۔ واپسی ٹکٹ کے لیے تیرہ ہزار ریال یعنی تیرہ سو تومان ادا کیے۔ اور اطمینان کا سانس لیا کہ سارا پروگرام وقت کے تنگ دامن کے عین مطابق بنا تھا۔ سارے معاملات طے کر کے کافی کا آخری پیالہ پیا اور صبح جلدی اُٹھنے کا جذبہ لے کر اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے جنھوں نے ...

ایرانی ٹی وی پر آج بھی کانفرنس کا احوال لیڈ کی سٹوری تھا۔ نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلے گئے اور پھر وہی ہوا کہ ٹھیک پانچ بجے روم سروس کا مستعد ویٹر ناشتے کی ٹرے لیے دروازے پر موجود تھا۔ دو روز کے سفر کے لیے کچھ پارچہ جات اور ضروری چیزیں رات ہی کو بیگ میں منتقل کر لی تھیں۔ سیّد صاحب بھی بیدار ہو چکے تھے اور جب اپنے جلدی جاگنے کا رُعب ڈالنے کے لیے ڈاکٹر فاروق حسنات کا دروازہ کھٹکھٹایا تو شرمندگی ہوئی کہ موصوف بڑے اطمینان سے شیو بنا رہے تھے اور ناشتے کی ٹرے پہلے ہی اُن کے معدے میں اُتر چکی تھی۔ تیّار ہو کر لابی میں پہنچے۔ مندوبین یکے بعد دیگرے نیچے اُتر رہے تھے۔ لابی میں ایک بار پھر رونق تھی۔ سامان گاڑیوں میں رکھا گیا اور یہ قافلہ ایک بار پھر تہران کی سڑکوں پر رواں دواں تھا اَب ہم کانفرنس کے مندوب کم اور سیّاح زیادہ لگ رہے تھے۔ تاہم کانفرنس کا نشان سب نے سینوں پر آویزاں کر رکھا تھا۔ ایئر پورٹ پر وہی روائتی گہما گہمی تھی۔ یہ بوئنگ ۷۲۷ کی فلائٹ تھی۔ تہران ایئر پورٹ خاصا مصروف ہوائی اڈہ ہے۔ حالانکہ ابھی صرف قومی ایئر لائن ہی آپریشن میں ہے اور کوئی غیر ملکی جہاز یہاں نہیں آتا مگر اس کے باوجود ہر تین منٹ کے بعد ایک فلائٹ آ اور جا رہی تھی۔ تہران سے اصفہان کی فلائٹ تقریباً ۴۰ منٹ کی تھی۔ چائے کا کپ پیتے اور جہاز میں ملنے والے اخبارات کی سُرخیاں دیکھتے اصفہان آ گیا۔ فضائی نظارہ بڑا خوبصورت تھا۔ چاروں طرف پہاڑ دکھائی دے رہے تھے اور ایئر پاکٹ بھی خاصی تعداد میں تھے۔ جہاز بھی چھوٹا تھا اس لیے

جھٹکے کچھ زیادہ ہی لگے۔ اصفہان کی سرزمین پر اُترے تو دن خاصا روشن اور قدرے خنک تھا۔ اصفہان ائیرپورٹ شہر سے تقریباً دس پندرہ میل باہر ہے۔ ہوائی اڈے سے باہر نکلنے لگے تو بلوچ جوان دکھائی دیئے وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھے اور سندھ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے جب چار پانچ پاکستانیوں کو غیر ملکیوں کے اس ہجوم میں دیکھا تو فرطِ جذبات سے آگے بڑھے اور ہمارے ساتھ ہاتھ ملائے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس مصافحے کا خلوص اور گرمی مجھے زندگی بھر یاد رہے گی۔

ائیرپورٹ سے اصفہان شہر کا سفر خاصا طویل تھا۔ ہمارے گائیڈ مسٹر رجادی بس کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑے تھے۔ ایک سپیڈ بریکر پر اچانک دروازہ کھل گیا اور اس سے پہلے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا۔ لبنانی اخبار نویس نے اُن کا کوٹ تھام لیا ورنہ اُن کے گرنے میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ اس پر ہم سب نے اُنہیں نشست پر بیٹھنے کو کہا۔ خوف کی ایک عجیب سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ اصفہان کا تمام راستہ کشادہ اور خوبصورت سڑک ہمارے ساتھ چلتی رہی۔ دائیں بائیں اصفہان کے مضافات تھے جہاں کچے گھروں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ دُور تک پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ اور ہر طرف سرسبز و شاداب کھیت اصفہان کے زرخیز اور فطری حُسن سے مالامال ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ شہر میں داخل ہوئے تو رواں دواں زندگی کا ایک کُھلا منظر پیشِ نظر تھا۔ ہمیں سیدھا مہمان سرائے عباسی ہوٹل لے جایا گیا۔ اسی ہوٹل کو ایران کی تاریخ میں اس لیے بھی خاصی اہمیت حاصل ہے کہ اس کا شمار ایران کی قدیم ترین عمارات میں ہوتا ہے۔ مگر آج اس کا حُسن دیکھ کر ایران کی عظیم ثقافت کی جھلک سامنے آجاتی ہے۔ یہ ایک مہمان سرائے تھی جسے شاہ عباس کے زمانے میں قائم کیا گیا تھا۔ اس دُور میں یہاں گھوڑوں کے اصطبل، قہوہ خانے، مہمان خانے اور دیگر کئی عمارات بنائی گئی تھیں جو وقت کے ساتھ اپنی صُورت بدلتے بدلتے رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایک عظیم الشان ہوٹل کی عمارت میں تبدیل ہو گئیں۔ یہ عمارت بلاشبہ اپنے فنِ تعمیر

اور آرائش کے حوالے سے دنیا کی خوبصورت ترین عمارات میں سے ہے ۔ یہاں آپ کو نقش نگاری اور شیشہ کاری کے ایسے خوبصورت نمونے ملیں گے کہ آپ ان کو تخلیق کرنے والے فنکاروں کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکیں گے ۔ ہوٹل کی لابی میں ایک ہجوم ہوگیا تھا۔ مسٹر رجاوی کاؤنٹر پر کھڑے مہمانوں کی فہرست کو ہاتھ میں لیے کمروں کی چابیاں تقسیم کر رہے تھے۔ وہ اُونچی آواز میں نام پکارتے اور مہمان باری باری چابی لے کر اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ کمروں کا انٹریئر اور وُڈ ورک دیکھ کر اپنے فیصل آباد کا سرینہ ہوٹل بھی یاد آیا۔ ہوٹل کی عمارت کے درمیان ایک طویل و عریض باغ بھی ہے ۔ اعلان یہ کیا گیا تھا کہ ہاتھ منہ دھو کر ریسٹورانٹ میں چائے کافی پی لیں۔ اس کے بعد روانگی ہوگی اور بعض تاریخی عمارات دیکھنے کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا جائے گا اور شام میں پھر سیر و تفریح ۔ سامان کمرے میں رکھا۔ ہاتھ منہ دھویا اور واپس لابی میں آگئے ۔ ڈائننگ ہال سے ملحقہ ایک بڑے ہال میں ایک آرٹ گیلری ہے۔ یہاں اصفہان کے معروف فنکاروں کی آئل پینٹنگز، خطاطی کے نمونے اور عکسی تصاویر وغیرہ کی نمائش لگی رہتی ہے۔ اتنی خوبصورت جگہ کو دیکھنے کے بعد چائے یا کافی کا ہوش کِسے تھا۔ بعض دیگر مندوب بھی نمائش دیکھنے میں مصروف تھے۔ میں نے اسی ہوٹل میں ۳۶ گھنٹے قیام کے دوران تقریباً ۴ مرتبہ یہ نمائش دیکھی اور خاصا لطف اندوز ہوا۔ ایرانی مصوّروں کے موضوعات بھی فطری مناظر تھے۔ لینڈ سکیپ اُستاد اللہ بخش کی یاد تازہ کر رہے تھے اور خطاطیاں دیکھ کر اپنا مُرشد صادقین یاد آرہا تھا۔ روانگی کا نقارہ بجتے ہی پھر سفر کا آغاز ہوا۔ اب ہمارے ساتھ ایک گائیڈ بھی تھا جو صاف انگریزی میں ہمیں اصفہان کی تاریخ اور ثقافتی ورثے سے متعارف کروا رہا تھا۔

اصفہان کی تاریخی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہ عباسی اور صفوی حکمرانوں کا دارالخلافہ بھی رہ چکا ہے۔ ہماری پہلی منزل اصفہان کا مشہور صفوی محل تھا۔ جو ہوٹل سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ یہ محل جو اب ایک پُرانی عمارت کے طور پر محفوظ ہے اپنی ظاہری آن بان تو

کھو چکا ہے مگر اس کا ڈھانچہ، دیواریں، چھتیں، خواب گاہیں، میوزک ہال اور تالاب جوں کے توں موجود ہیں۔ اپنے لاہور کے شاہی قلعے کی طرح اس تاریخی عمارت کو محفوظ رکھنے کی پوری سعی کی گئی ہے۔ یہ محل ۱۷ ویں صدی کے آغاز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر سارے شہر کا خوبصورت منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ محل کی دوسری منزل کی چھت لکڑی کے بڑے بڑے ستونوں پر آج بھی قائم ہے اور یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ یہ لکڑی آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہے نہ تو اسے موسمی اثرات نے خراب کیا ہے اور نہ کہیں دیمک لگی ہے۔ محل کے شمال کی جانب اصفہان کا پُرانا شہر دکھائی دیتا ہے۔ اصفہان کو اگر ایران کا پہلا اسلامی مرکز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں مساجد کی بھی بہتات ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت مسجد اس شہر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مسجدوں کی بہتات دیکھ کر ہیں اسے شہرِ مساجد کہنے پر مجبور ہوں۔ محل کے دائیں جانب مسجد امام ہے جس کی بلند و بالا محرابوں اور نقش و نگار کی خوبصورتی کی مثال دینا مشکل ہے۔ محل کی دوسری منزل پر دو میوزک ہال ہیں، ان کا طرزِ تعمیر کچھ اس طرح ہے کہ یہاں بیٹھ کر اگر کوئی ساز بجایا جائے تو آواز چھوٹے چھوٹے گنبدوں سے ٹکرا کر ایک خوبصورت تاثر پیدا کرتی ہے۔ یہاں بادشاہ " دل پشوری " کیا کرتے تھے اور مغنیوں اور موسیقاروں کے فن سے لطف اندوز ہوئے تھے۔ ہم محل کی چھت پر کھڑے ایرانی فنِ تعمیر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک امریکی مندوب نے الزبتھ کو متوجہ کرنے کے لیے اس کا بازو پکڑا۔ الزبتھ نے اس پر شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا اور کہنے لگی :

" Do not touch me " اس پر یقینی طور پر امریکی مندوب کو حیرت ہوئی ہو گی۔ اس نے کہا: " ڈونٹ بی سلی " اس پر الزبتھ پھر بولی :

You Americans are very funny

میرے لیے یہ مکالمہ خاصا دلچسپ تھا۔ الزبتھ خود کو پوری طرح ایرانی قوانین کی پابند ثابت کرنے پر تُلی تھی ورنہ کہاں ایک برطانوی خاتون اور وہ بھی کسی امریکی کے ہاتھ لگانے

سے بدک جائے۔ محل کی چھت سے ہم نے چند تصاویر بنائیں۔ چھت کے اُوپر ایک تالاب بنایا گیا تھا جس میں فوّارے نصب تھے۔ یہ تالاب اَب خشک ہو چکا ہے، فوّارے ٹوٹ گئے ہیں مگر عہدِ رفتہ کی یاد ابھی باقی ہے۔ محل کی بالکونی کے دائیں اور بائیں آیت اللہ خمینی اور آیت اللہ منتظری کی قدِ آدم تصاویر آویزاں ہیں اور اس چوک کے چاروں طرف مارکیٹیں ہیں، جہاں آپ کو منی ایچر ز کے ایسے ایسے نمونے ملیں گے اور اس قدر سستے کہ آپ حیران رہ جائیں گے

محل سے نکلے تو مسجد امام سامنے تھی۔ مسجد کی تزئین کا کام اِن دِنوں زور شور سے جاری ہے۔ بڑے بڑے گنبد اور وسیع و عریض صحن پر مشتمل یہ خوبصورت مسجد بھی فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس مسجد کا آغاز صفوی دَور میں ہوا، پھر عباسیوں نے اس کی تعمیر کی مگر اسے شاہ عباس کے ایک وزیر شیخ بائی نے مکمل کیا۔ مسجد کے اندر پتھر کی ایک ایسی سل ہے کہ جس پر اُس وقت سایہ آتا ہے۔ جب دن کے پُورے بارہ بجے ہوتے ہیں۔ سال کے ۳۶۵ دن صرف بارہ بجے دوپہر ہی سایہ اِس پتھر پر آتا ہے۔ گائیڈ ہمیں تفصیلات بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ فنِ جیومیٹری کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کے بارے میں جان کر بڑے بڑے حساب دان دنگ رہ جاتے ہیں۔ وہ ہمیں مسجد کے مختلف حصّوں کی سیر کرا رہا تھا۔ اس مسجد میں ایران کے قدیم فنِ خطاطی کے بھی اعلیٰ ترین نمونے تختیوں پر لکھے ہیں۔ مسجد کے گنبدوں کی اُونچائی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے گردن کو ۱۸۰ کے زاویے پر لانا پڑتا ہے۔ اس گنبد کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے تالی بجائی تو اس کی بازگشت ۷ مرتبہ سنائی دی۔ یہ تجربہ ہمارے دیگر غیر ملکی دوستوں نے بھی کیا۔ اور خاصی دیر محظوظ ہوتے رہے۔

گائیڈ کا کہنا تھا کہ جس زمانے میں لاؤڈ سپیکر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ مؤذن اسی ایک گنبد کے نیچے کھڑا ہو کر اذان پڑھتا تھا اور یوں اذان کی آواز ایک وقار کے ساتھ گونجتی بھی اور دُور دُور تک لوگوں کو سنائی دیتی تھی۔ مسجد امام کے ساتھ ہی ایک اور خوبصورت مسجد شیخ لطف اللہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مسجد احاطے کے حوالے سے چھوٹی ہے مگر یہاں بھی خطاطی اور

نقش نگار کے بیش بہا نمونے موجود ہیں۔ میرے لیے اب ایک بڑا مسئلہ کیمرے کی فلم کا تھا روزنامہ "اطلاعات" سے حاصل کی گئی بلیک اینڈ وائٹ ختم ہو گئی تھی اور یوں مجھے بھاگ دوڑ کر کے کبھی ڈاکٹر حسنات، کبھی سیّد صاحب اور کبھی فیض مصطفےٰ کی منت سماجت کرنا پڑ رہی تھی اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی لینا پڑتا تھا کہ وہ اپنی فلمیں ڈویلپ کرا کے اس کی کاپیاں ضرور ارسال کریں گے۔ شاہ صفوی کا محل، مسجد امام اور مسجد شیخ لطف اللہ دیکھنے میں خاصا وقت لگا تھا اور اب تمام چہرے تھکن زدہ دکھائی دے رہے تھے۔ میں اور کرنل صاحب مارکیٹ میں گھومتے رہے۔ یہاں تہران کے مقابلے میں منی ایچر پینٹنگز کی قیمتوں میں ۵۰ فیصد کا فرق تھا طے یہ پایا کہ شام میں آکر خریداری کی جائے یا پھر صبح دیکھا جائے۔ ایک دُکاندار کا کہنا تھا کہ صرف سیاحوں کی خاطر جمعہ کے روز نماز سے پہلے چند دُکانیں کھلتی ہیں چنانچہ ہم نے اسی بھروسے پر یہ طے کیا کہ خریداری صبح کی جائے۔ مگر ابھی صرف ونڈو شاپنگ پر ہی گزارا کیا جائے

کرنل صاحب کو ایک ایش ٹرے بہت پسند آیا تھا جس کی قیمت صرف ۵ تومان تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ دوستوں اور خاص طور پر سگریٹ نوش دوستوں کے لیے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہ معاملہ کل پر چھوڑ کر ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ پوری مارکیٹ چھان ماری مگر مجھے کیمرے کی فلم نہ مل سکی اور یہ معاملہ ہنوز طے ہونا باقی تھا۔

دوپہر کے کھانے کا زبردست اہتمام تھا۔ ہوٹل کا ڈائننگ ہال دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی تاریخی یا کاسٹیوم فلم کا سیٹ لگا ہو (کتاب میں شامل چند تصاویر دیکھ کر آپ کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا) حسبِ معمول سُوپ پیش کیا گیا اور پھر وہی سلاد اور چاول کباب راجندر سرین کباب آنے سے پہلے ہمیں مطلع کر چکے تھے کہ اس شہر میں ایران کا بہترین چلو کباب ملتا ہے اور اتفاق سے یہ تھا بھی وہی چلو کباب، کھانے کے بعد راجندر سرین کی بات پر یقین آیا۔ ایران میں قیام کے دوران کئی مرتبہ چلو کباب کھانے کا اتفاق ہوا تھا مگر اس کباب کا ذائقہ ہی کچھ اور تھا۔ یہاں بھی بیئر بغیر الکوحل کے میسّر تھی، آب علی بھی تھا اور کولا بھی۔ کھانے

کے بعد سویٹ ڈش کا مرحلہ آیا۔ مَیں اَب تک اپنے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کریم اور چکنائی سے پرہیز کر رہا تھا تاکہ پردیس میں کولیسٹرول بڑھ جانے سے کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ اسی لیے ابھی تک انڈوں کی زردی کا وہ مزیدار حلوہ نہیں چکھا تھا۔ جس سے بائی پاس یافتہ سیّد افضل حیدر میرے سامنے کئی مرتبہ لطف اندوز ہو چکے تھے اور نہ ہی ایران مکھن کو منہ مارنے کی ہمّت ہوئی تھی البتہ تھوڑا بہت نمکین پنیر بد پرہیزی کے زُمرے میں ضرور آ رہا تھا سو اللہ کا نام لے کر اتنی سی بد پرہیزی جاری تھی۔ اَب جو کھانے کے بعد آئس کریم کے کپ سامنے آئے تو پہلے تو مَیں اُنہیں دیکھ کر خاصا ہچکچایا۔ پھر ڈاکٹر حسنات احمد کے کہنے پر ایک چمچہ جو چکھا تو چکھنے چکھنے میں ساری آئس کریم غائب۔ اِتنی لذیذ آئس کریم شاید ہی کبھی کھائی ہو۔ ممکن ہے دُنیا میں اس سے بھی بہتر فلیور موجود ہوں مگر گلاب کی خوشبو والی یہ آئس کریم زندگی میں پہلی مرتبہ کھائی تھی اور دیگر لوگوں سے استفسار پر بھی معلوم ہوا کہ اُنہوں نے بھی اسے زندگی میں پہلی بار چکھا ہے۔ کرنل صاحب کہنے لگے یہ یقیناً گلاب کے عرق میں بنی ہے۔ کیا ٹیسٹ ہے صاحب واہ! لاجواب۔ میں نے راجندر سرین سے کہا اس کا فارمولا معلوم کرنا چاہیئے اور اگر کہیں لبرٹی کے کسی کونے میں ایک تھڑا مل جائے اور گلاب آئس کریم کا یہ فلیور لاہوریوں کو پسند آ جائے تو ایک دو برس میں پی بلاک میں بنا بنایا گھر خریدا جا سکتا ہے۔ اس پر سیّد صاحب کہنے لگے ساتھ ساگ اور مکئی کی روٹی یا کڑھی چاول بھی لگا لینا کوٹھی ۶ ماہ میں بن جائے گی۔ سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور پھر اسی کے ساتھ ہی لاہوریوں کی خوش خوراکی کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ روز کے کتنے مُرغ کھاتے ہیں، کتنی گوشت بالٹی چلتی ہے، کتنے چنے، سموسے اور حلوہ پوری، پائے اور کھدّیں کھا جاتے ہیں۔ یہ حساب کتاب کا ایک طویل سلسلہ تھا جو بالآخر چینی کھانوں کے تذکرے پر ختم ہوا۔ کھانا اتنا سیر ہو کر کھایا تھا اور سیر اتنی جی بھر کر کی تھی کہ اَب صرف ایک ہی پروگرام ہو سکتا تھا اور وہ تھا خوابِ خرگوش کے مزے، رجاوی صاحب نے صرف ایک گھنٹہ آرام کرنے کی مہلت

دی تھی اور اس کے بعد شام کی سیر کا ایک الگ پروگرام تھا۔ کمرے میں پہنچا تو ایک روم اٹنڈنٹ برآمدے میں بیٹھا تھا۔ یونہی اسے آواز دے کر کمرے میں بُلا لیا اور ہو گیا انٹرویو شروع۔ موصوف ۲۷ برس سے اسی ہوٹل میں ملازم ہیں۔ اور بقول اُن کے اُنہیں پاکستان کے سابق صدر ایوب اور ذوالفقار علی بھٹو سمیت درجنوں غیر ملکیوں سربراہوں اور اہم شخصیات کی میزبانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اصفہان کی تاریخی اہمیت ہی کچھ ایسی ہے کہ مملکت کے مہمانوں کو یہاں ضرور لایا جاتا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ہوٹل کی لابی سے اُوپر والی منزل پر ایک مخصوص سویٹ ہے جسے رضا شاہ پہلوی نے اپنے لیے مخصوص کروا رکھا تھا۔ ماضی کی یادیں کریدتے ہوئے اس نے بتایا کہ انقلاب ایران سے پہلے یہ ہوٹل امرائ د رؤسائ کا عشرت کدہ تھا جہاں دُور دراز سے صاحبانِ ثروت دادِ عیش دینے آتے تھے مگر اب یہ سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اَب تو مہمان بھی کم کم ہی آتے ہیں اور انقلابِ ایران سے ہوٹلنگ کے بزنس کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ کیونکہ بڑے ہوٹلوں کی تعمیر کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہاں رہائش کے علاوہ دیگر ضروریات کا بھی اہتمام ہے۔ مجھے فوراً اپنے ہاں کے فلیٹیز، ہلٹن اور پرل کا خیال آیا۔ خاص طور پر فلیٹیز کا تو یہی حال ہے کہ وہاں منافع صرف پرمٹ روم سے ہوتا ہے ورنہ یہ ہوٹل سخت خسارے میں جا رہے ہیں اور اگر اُن کا شراب فروخت کرنے کا لائسنس بھی ختم ہو جائے تو نہ جانے کیا بنے یوں ایک گھنٹے کے آرام کی جو مہلت ملی تھی وہ میری فطری اخبار نویسی کی نذر ہو رہی تھی۔ اٹنڈنٹ اَب مجھ سے سوالات کر رہا تھا وہ جنگ کے بارے میں خاص طور پر بے یقینی کا شکار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جنگ بندی کا اعلان محض بڑی طاقتوں کی کوئی چال ہے اور یہ جنگ بند ہونے والی نہیں مگر جب میں نے اُسے اس بات کا یقین دلایا کہ یہ معاملہ اَب واقعی ختم ہونے والا ہے اور کوئی بڑی سازش نہ ہوئی تو جنگ ایک دو روز میں یقیناً بند ہو جائے گی۔ اس نے بتایا کہ عراقی جہاز اصفہان پر بھی مسلسل بمباری کرتے رہے ہیں اور اس سے خاصا جانی و مالی نقصان ہوا ہے۔ ورنہ یہ شہر بڑا پُرسکون اور

امن کا گہوارہ تھا۔ اٹنڈنٹ چلا گیا تو میں سوچنے لگا یہ جنگ بھی کتنی خوفناک چیز ہے۔ انسان سے اس کا اعتماد تک چھین لیتی ہے۔ اب آرام کا وقت کہاں تھا۔ ہاتھ منہ دھویا، کپڑے تبدیل کیے، کیمرہ گلے میں لٹکایا اور پھر لابی میں نیچے گیا۔ مسٹر رجاوی مہمانوں کے منتظر تھے مگر اب نفری کچھ کم تھی، شاید بہت سوں کو نیند نے آ لیا تھا۔ معلوم ہوا کہ اب ہم شاہ عباس اوّل و دوم تعمیر کردہ محل چہل ستون (چالیس ستونوں والا محل) دیکھنے جا رہے ہیں۔ شام ہو رہی تھی اور اب بازاروں میں خاصی رونق تھی، گاڑیاں "ایرانی رفتار" کے ساتھ سڑکوں پر رواں دواں تھی ہماری بس جونہی اس باغ کے صدر دروازے پر رُکی جس کے اندر یہ تاریخی محل واقعہ ہے۔ میری نظر فوٹوگرافی کی ایک دُکان پر پڑی۔ میں بھاگم بھاگ دُکان میں پہنچا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ رنگین فلم دستیاب تھی۔ فلم کا نرخ معلوم کیا تو ۲۶۰۰ ریال یعنی ۲۶۰ تومان تھا مگر اس وقت یہ فلم رول کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ جلدی جلدی فلم کیمرے میں لوڈ کی اور ساتھیوں سے آن ملا۔

محل کے برآمدے میں محل کی تاریخ کے بارے میں ایک بورڈ آویزاں تھا۔ چالیس ستونوں والے اس محل کے ستون بھی لکڑی کے تھے اور ہمارے لیے پھر وہی بات حیرت کا باعث تھی کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی لکڑی جُوں کی تُوں کیسے ہے۔ کرنل صاحب کا خیال تھا کہ شاید اس دور کے عمارت ساز کسی خاص قسم کے کیمیائی مادے کی ایجاد میں کامیاب ہو گئے ہوں جس نے لکڑی کے ان ستونوں کو آج تک شکست و ریخت سے بچائے رکھا ہے۔ محل کے چاروں جانب ایک طویل و عریض باغ ہے جو مختلف پُشتوں پر مشتمل ہے۔ اِس محل کو دیکھ کر اپنا شالامار باغ اور جہانگیر کا مقبرہ بہت یاد آئے، ویسی ہی اُداسی اور سکون یہاں بھی موجود تھا۔ باغ کے صدر دروازے کے اندر ایک روائتی قہوہ خانہ بھی تھا جس کے باہر لکڑی کے بنچوں پر

میں نے اُن سے خیریت دریافت کی، حال احوال پوچھا اور وہ صرف فارسی میں جواب دیتے رہے

تاہم میرے اشارے پوری طرح اُن کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ قہوہ خانے کے اندر بھی "حُقّہ بازی" کا اہتمام تھا اور گرم گرم چائے بھی، وہی ایرانی چائے بغیر دُودھ کے۔ یہاں چائے کا نرخ صرف ۱۰ ریال یعنی ایک تومان تھا۔ چنانچہ اندازہ ہوا کہ فائیو سٹار ہوٹل اور قہوہ خانے کے نرخ میں ایک آٹھ کا فرق ہے جہاں مینو کارڈ پر چائے کا نرخ ۸ تومان تھا۔ یہاں چائے پینے کا اپنا ہی لطف تھا۔

محل چہل ستون سے نکلے تو گائیڈ نے بتایا کہ اَب ہم دریائے زندہ رود کی طرف جا رہے ہیں۔ ایرانی عوام پر ہونے والے جنگی مظالم کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ ہم نے یہ طویل جنگ صرف انقلاب ایران کے تحفظ کے لیے لڑی ہے، ہمیں اپنی دھرتی جان سے بھی پیاری ہے اور اگر عراق یا اس کا کوئی اور اتحادی دُنیا بھر کا اسلحہ بارود بھی اکٹھا کر کے لے آئے تو ایرانی قوم کو شکست نہیں دے سکتا۔ اس نے بتایا کہ عراق نے اصفہان پر کئی بار میزائلوں اور بموں سے حملے کیے مگر وہ اہلِ اصفہان کے جذبۂ شہادت کو نہ مار سکے۔ اس نے بتایا کہ اصفہان سے سینکڑوں کی تعداد میں جوان جامِ شہادت پی چکے ہیں اور اس کا اندازہ آپ کو گلستانِ شہداء میں ان شہیدوں کی قطار اندر قطار قبریں دیکھ کر ہو جائے گا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ چھ ماہ پہلے بم کے ایک حملے میں اس کی بیوی اور بھائی شہید ہو چکے ہیں اور وہ خُود بھی جامِ شہادت نوش کرنے کے لیے تیار ہے تو بس میں بیٹھے ہوئے ہر مندوب کے ہاتھ خُود بخود اُٹھ گئے مرحبا مرحبا کا ایک شور بلند ہوا اور بس تالیوں سے گُونج اُٹھی۔ بس گلستانِ شہداء کے قریب رُکی۔ بس میں بیٹھے ہی سب لوگوں نے یہ عظیم قبرستان دیکھا۔ مسلمانوں کے ہاتھ فاتحہ کے لیے اُٹھ گئے۔ میرے لیے بھی جذبات پر قابو رکھنا مشکل تھا، مَیں نے دیکھا کہ بھارت سے آئے ہوئے دوست عبدالکریم کے ہاتھ دُعا کے لیے بلند ہیں اور اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ یہ ان شہیدوں کو خراجِ عقیدت تھا جو تنخواہ دار فوجی نہ تھے صرف ایک جذبہ تھا جو انہیں شہادت کے رُتبے سے سرفراز کر گیا۔ بس کی فضا چند لمحوں کیلئے

سوگوار ہوگئی تھی۔ میرا دل مچل رہا تھا کہ میں نیچے اُتروں اور ان قبروں کی زیارت کروں مگر وقت کے دامن کی تنگی مانع تھی۔ میں نے کرنل صاحب سے کہا کہ اس طرح تو بات نہیں بنتی۔ اس پر زیدی صاحب بولے صاحبزادے گھبراؤ نہیں، رات اپنی ہے۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ قافلہ

رُومی انہیں جنّت کی سیر کو لے جاتے ہیں تو وہاں ایک دریا کا تذکرہ ہے جس کا نام یہی زندہ رُود یعنی دریائے زندگی ہے۔ میں نے اپنے اس خیال کی تصدیق سیّد افضل حیدر سے کی اور اس تصدیق کے ساتھ ہی میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ میں آج وہی دریا دیکھنے جا رہا تھا جس کے خواب علامہ اقبال نے دیکھے تھے۔ پہاڑوں میں سے بہتا ہوا یہ دریا اصفہان کے درمیان میں سے گزرتا ہے۔

ہماری بس ایک پُل کے قریب رُک گئی یہاں محرابوں والا ایک پُل ہے۔ پانی ان محرابوں کے نیچے سے گزر کر دوسری طرف آبشار کی صُورت میں گر رہا تھا اور دریا کے دونوں کناروں اور پُل پر ایک بڑا ہجوم تھا۔ اصفہان کے رہنے والے بڑی تعداد میں تفریح کے لیے یہاں آئے تھے۔ یہاں ایک محراب میں ہماری تواضع کا اہتمام تھا جس میں پھل اور اصفہان کا روائتی تحفہ "گز" پیش کیے گئے۔ گز ایک مٹھائی کا نام ہے جس میں ثابت پستے کی آمیزش ہوتی ہے اور گز اصفہان پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ہم دھڑا دھڑ تصاویر بنا رہے تھے۔ لوگوں اور خاص طور پر نوجوان کا ایک بڑا ہجوم ہمارے گرد اکٹھا ہوگیا تھا جسے وہاں ڈیوٹی پر موجود سیکورٹی گارڈ ہٹانے میں مصروف تھے۔ ہم لوگ ایک محراب میں پہنچے جہاں قدیم طرز کا قہوہ خانہ قائم ہے۔ یہاں محراب کی چھت اور دیواریں تصویروں، قطعات اور آیات کے کتبے سے بھری پڑی تھیں۔ ہر طرف حُقّے موجود تھے اور اب ایک بار پھر حُقّے کی باری تھی۔ ایک ایرانی حرمل کی دھونی دے رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا، ماحول اس قدر دل خوش کُن تھا کہ مَیں نعرۂ حیدری بلند کرتا رہا اور زیدی صاحب بار بار نعرۂ صلوٰۃ۔ یہاں ہم تقریباً آدھ گھنٹہ ٹھہرے

مگر یوں لگ رہا تھا جیسے ہفتوں سے ہمارا قیام یہیں ہو۔ دریا کے ایک کنارے ایک بھُٹہ فروش گرماگرم دُودھیا بھُٹے بیچ رہا تھا۔ میں نے دو بھُٹے خریدے اور سیّد صاحب، فریدہ اور فرح نے بھی آدھا آدھا بھُٹہ کھایا۔ بڑا لذیذ بھُٹہ تھا۔ نرم نرم دُودھیا۔ زندہ رُود کی سیر کا لُطف بھی بیان سے باہر ہے۔ مگر اس وقت صُورتِ حال ذرا پریشان کُن ہوگئی جب میں نے دیکھا کہ چند نوجوان امریکی مندوبین کو عجیب و غریب نظروں سے گھُور رہے ہیں وہ اس بات کو کنفرم بھی کر رہے تھے کہ یہ امریکی ہیں یا کوئی اور شاید یہ بات منتظمین نے بھی محسوس کرلی تھی لہٰذا وہاں سے نکل جانے ہی میں خیریت تھی۔ لوگوں کا حوصلہ کتنا ہی بلند ہو۔ قاتل کو سامنے دیکھ کر جذبات پر کنٹرول کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا اور ہمارا قافلہ واپس ہوٹل جا رہا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے کرنل صاحب سے گزارش کی کہ ایک چکر مارکیٹ کا لگانا چاہیئے۔ کچھ خریداری بھی کرلی جائے اور قیمتوں کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ میرے ذہن میں چند دوستوں کی فرمائش کے فیروزے اور خاص طور پر شیخ اُمید علی صاحب کا یاقوت تھا۔

میرا خیال تھا کہ موقع اچھا ہے ابھی سب لوگ آرام کریں گے۔ اب صبح تک اور کوئی پروگرام نہیں سوائے رات کے کھانے کے تھوڑی بہت خریداری آسانی سے ہوسکتی ہے۔ کرنل صاحب نے میرے خیال کی تائید کی اور ہم مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔ جوہری مارکیٹ اعظم کلاتھ مارکیٹ کی طرز کی تھی اُوپر چھت اور نیچے آمنے سامنے دُکانوں کی قطاریں، یہاں آکر جب پتھروں کی قیمتوں کا احوال معلوم ہوا تو یہ یقین ہوگیا کہ قیمتی پتھروں کے تحائف اپنی پہنچ سے باہر ہیں۔ فیروزہ کہیں بھی ۵۰۰ تومان سے کم میں نہیں تھا اور یاقوت ہزاروں میں تھے، سونے کا ایک لاکٹ دیکھا اس پر حضرت علیؑ کی شبیہہ بنی تھی، قیمت تو ہمارے ہاں کے سونے سے کم تھی مگر یہ سارا سونا ۱۸ قیراط کا تھا اس لیے یہاں بھی کچھ حوصلے نے ساتھ نہ دیا۔ کپڑوں کی ایک دُکان میں داخل ہوئے تو جی بہت خوش ہوا۔ سلا سلایا گرم سُوٹ صرف ۲۰۰۰ تومان میں مل رہا تھا اور جس حساب سے مَیں نے کرنسی خریدی تھی۔ یہ صرف ۴۰ ڈالر کا

بنتا تھا مگر یہاں مصیبت یہ تھی کہ مجھے آج تک ریڈی میڈ میں اپنے سائز کا کوئی کپڑا نہیں ملا۔ ماپ کے مسئلے نے سُوٹ سے بھی محروم رکھا۔ تاہم بچّوں کے لیے چند سویٹر وغیرہ خرید لیے۔ یہ خاصے سستے تھے۔ اب فیصلہ ہوا کہ گز اور خشک میوہ جات کی خریداری پر ہی اکتفا کیا جائے۔ فیروزے شاید مشہد میں سستے مل جائیں۔ خشک میوے خاصے سستے تھے، پستہ، بادام، چنے، کشمش وغیرہ خریدے۔ کچھ پیکٹ گز کے لیے تاکہ احباب کے لیے تحفے کا کام دے سکیں اور یوں ڈیڑھ دو گھنٹے کی مشقت کے بعد ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ اس خریداری سے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ کام عورتیں، مردوں سے بہتر کرتی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں عورتوں ہی کو اس کام کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔

ہوٹل آکر معلوم ہوا کہ ابھی تک ہمارے میزبانوں کا فوجی حکام سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ اس لیے شاید کل خرم شہر کی سیر نہ ہوسکے اور ہم اپنی آنکھوں سے جنگ کے اثرات دیکھنے سے محروم رہ جائیں اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب مسٹر رجاوی نے یہ اعلان کر دیا کہ یہ معاملہ طے نہیں ہوا اس لیے ہم سب کو کل جمعہ کی نماز کے بعد واپس تہران جانا ہے۔ جہاز چارٹر کرایا جا چکا ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے خاصی مایوس کُن تھی تاہم انہوں نے یہ حوصلہ ضرور دیا تھا کہ رابطے کی کوششیں جاری ہیں اور شاید صبح تک معاملات اُمید افزا ہو جائیں۔ زیدی صاحب مجھے شام "رات اپنی ہے" کا جُملہ کہہ چکے تھے۔ اب صرف پروگرام پوچھنا باقی تھا۔ میرے استفسار پر زیدی صاحب کہنے لگے ابھی صبر کرو آج تمہیں گلشن شہدا، کا وہ منظر دکھائیں گے ساری عمر یاد رکھو گے۔ اسی اثنا میں مجھے یاد آیا کہ صبح اٹنڈنٹ نے رضا شاہ پہلوی کے خصوصی سوئیٹ کا تذکرہ کیا تھا۔ میں نے اسے دیکھنے کی خواہش کا بھی اظہار کر دیا۔ اب ہوٹل والے ہماری اس خواہش کو رد کرنے کی پوزیشن میں کہاں تھے۔ ہمیں گروہ کی صورت میں اس مخصوص حصّے میں لے جایا گیا۔ ایک خصوصی بیڈ روم کے ساتھ دیگر چھوٹے چھوٹے کمرے، آرائش کا کمرہ، سیکورٹی کا کمرہ وغیرہ ہوٹل کے اس مخصوص حصّے میں بنائے گئے تھے۔ یہ ہوٹل کا وہ

حصّہ تھا جہاں بیسویں صدی کے ایک بڑے آمر نے زندگی کی نہ جانے کتنی راتیں دادِ عیش دیتے ہوئے گزاری ہوں گی اور اب اس کی ویرانگی "مٹے ناموں کے نشان کیسے کیسے" کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

اب رات کے کھانے کی باری تھی۔ دن میں تو چلو کباب نے خوب مزہ دیا تھا۔ اب جو کھانے کا بلاوا آیا تو طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی۔ ہوٹل کے باغ میں ڈنر کا اہتمام تھا، اور وہ بھی کینڈل ڈنر تھا تاہم کھانا میزوں پر ہی سروے کیا جا رہا تھا۔ چاول، روٹی اور دیگر لوازمات کے ساتھ روسٹڈ بیف سے تواضع کی جا رہی تھی۔ قریب ہی پھلوں کے ڈھیر لگے تھے۔ کھانے کے بعد قہوے کی باری آئی تو ہوٹل کی ایک محراب میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ یہاں ایک دلچسپ معاملہ ہوا۔ میں نے میز سے اپنی دانست میں، ایک چھوٹا سیب اٹھایا تھا مگر روشنی میں جا کر جب اس پر چھتری چلانے کی کوشش کی تو وہ آلو بخارا نکلا۔ سب لوگ فرش پر بچھے قالینوں پر بیٹھ گئے۔ گاؤ تکیے بھی مہیا کر دیئے گئے تھے۔ اور ایک ویٹر بھاگ دوڑ میں حقّوں کی چلمیں گرم کر رہا تھا۔ لمبی لمبی نے اور تازہ چلمیں کس کر صرف دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے کی تھی جس میں بہت کم لوگ کامیاب ہو رہے تھے۔ حقّے کا بھرپور کش لینا بھی ایک فن ہے۔ بہرحال تقریباً آدھ پون گھنٹہ یہ شغل چلتا رہا اور آپس میں خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اس دوران الزبتھ کے علاوہ امریکی مشنری کی بیوی بھی فریدہ اور فرح کی سہیلی بن چکی تھی اور خواتین کا یہ گروپ علیحدہ گپ شپ میں مصروف تھا۔ رات ہو چلی تھی اور خنکی میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا اور ہم چونکہ ۱۱۲ درجے کی گرمی چھوڑ کر گئے تھے اس لیے یہ خنکی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ محفل برخاست ہوئی تو زیدی صاحب کہنے لگے:

چلو بیٹا تیاری پکڑو ہم گلستانِ شہدا جا رہے ہیں۔ آج جمعرات ہے وہاں دعائے کمیل بھی ہوگی اور شہدائے کے وارث بھی بڑی تعداد میں شرینیاں بانٹ رہے ہوں گے۔ چنانچہ ہمارا قافلہ جو راجندر سرین، عبدالکریم، فیض مصطفےٰ، ڈاکٹر زیدی، سید افضل حیدر، فرح، فریدہ، لونان

میں ارنا کے نمائندے نواب گلزار حیدر اور راقم پر مشتمل تھا۔ گلستانِ شہدا، کی جانب روانہ ہوا۔ رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ گلستانِ شہدا، پر ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف قبرستان سے ملحقہ امام بارگاہ سے مولانا صاحب کی آواز آرہی تھی جو دعائے کمیل پڑھ رہے تھے۔ قبرستان کے دروازے میں داخل ہوتے ہی جذبات قابو میں نہ رہے۔ "السلام علیکم یا اہلِ قبور" کہتے ہوئے پُرنم آنکھوں سے قبرستان میں داخل ہوئے۔ قبروں کی زیارت کرتے ہوئے حضرت عباس علمدار؏ کے عَلَم کو سلام کرتے ہوئے جب قبرستان میں موجود قبروں کو دیکھا تو دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ قطار اندر قطار سینکڑوں شہدا کی ایک جیسی قبریں موجود تھیں۔ ہر قبر پر شہید کی ۱۲ × ۱۲ کی ایک تصویر لوہے کے فریم میں لگی تھی۔ کیسے کیسے جوان تھے جو راہئ اجل ہوئے، کیا حوصلے ہوں گے ان کے ماں باپ کے، بہن بھائیوں کے۔ یہ سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ امام بارگاہ میں مکمل اندھیرا تھا۔ یہ ایک طویل و عریض ہال تھا جس کے پہلے حصّے میں مرد اور دوسرے حصّے میں پردے کے پیچھے خواتین بیٹھی تھیں۔ کچھ خواتین قبرستان کی راہداریوں میں بھی بیٹھی تھیں۔ آہ و بکا کا ایک عالم تھا۔ خود دُعائے کمیل پڑھنے والے بھی گریہ کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حوصلے نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اب ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ ذاکر شہدائے کربلا کا پُرسہ دے رہے تھے، خطاب فارسی میں تھا مگر چونکہ جذبہ ایک تھا۔ اور دل میں ایک ہی بات موجزن تھی اس لیے ہر لفظ کی سمجھ آرہی تھی۔ ایک موقع پر ذاکر نے امام حسین علیہ السلام کو اُن کے جوان بیٹوں اور چھ ماہ کے شیر خوار علی اصغر؏ کا پُرسہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی حسین؏ سے یہ پوچھے کہ علی اکبر؏ اور علی اصغر؏ کی قبریں کہاں ہیں تو وہ کہیں گے کہیں اور نہیں یہ قبریں میرے دل میں ہیں۔ گریہ زاری اور ماتم کا ایک کہرام تھا جو اس ایک فقرے نے پوری امام بارگاہ میں بپا کر دیا تھا۔ خواتین کے حلقے سے اُٹھتی ہوئی چیخیں سینہ چیر رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا ان میں سے کسی کا بیٹا یہاں ہے تو کسی کا بھائی، کسی کا باپ ہے تو کسی کا سہاگ، یہ سب اپنے رشتوں کی قربانی دے کر امام؏ کو اُس کے بچّوں کا پُرسہ دے

رہی ہیں ۔ میرے دل سے ان کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں اور میں اُن کے حوصلوں کو سلام پیش کر رہا تھا۔ "یا خدا ! یہ کیسی بستی ہے جسے ان جوانوں نے اپنا خون دے کر آباد کیا ہے۔"
مجھ پر اس قدر رقّت طاری تھی کہ میرا جسم کانپنے لگا۔ دُعا جاری تھی، گریہ ہو رہا تھا کہ میرے قریب بیٹھے ہوئے سیّد صاحب باہر نکل گئے۔ مَیں بھی اُٹھا۔ باہر ایک قبر پر عجیب منظر پیشِ نظر تھا۔
ایک عُمر رسیدہ خاتون اپنے جواں سال بیٹے کی قبر پر گریہ کر رہی تھی۔ وہ قبر پر ہاتھ پھیرتی اور ایک ایسی چیخ مارتی کہ مجھے بار ہا ایسا لگا جیسے زمین کانپ رہی ہو۔ آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ ایک عجیب سا ماحول تھا۔ زیدی صاحب اس خاتون کو دلاسہ دے رہے تھے۔ قریب ہی کھڑے راجندر سرین کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ گلزار حیدر، عبدالکریم اور نواب بھی اسی کیفیّت کا شکار تھے اور میں سوچ رہا تھا غم، درد اور جذبہ کسی خاص عقیدے، مذہب، قوم یا خطۂ زمین پر رہنے والوں کی میراث نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی سانجھ ہیں جو دنیا کے ہر فرد کی میراث ہے۔
راجندر سرین ہندو ہیں، اُنہوں نے نہ تو کسی کو آنکھوں سے شہید ہوتے دیکھا اور نہ ہی کسی جوان کی لاش کو تڑپتے ہوئے دیکھا۔ یہ صرف محسوس کرنے کی بات ہے۔ وہ لوگ جن کے سینوں میں انسانیت کا درد ہوتا ہے یقیناً عظیم ہوتے ہیں۔ میں ایک قبر کے سرہانے بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مختلف شہدا کی قبروں پر اُن کے عزیز و اقارب بیٹھے تھے۔ کوئی قرآن کی تلاوت کر رہا تھا، کوئی گریہ میں مصروف تھا اور چھوٹے چھوٹے بچے ان شہدا کے نام کی شیرینی اور پھل تقسیم کر رہے تھے، ایک بچے نے میرے ہاتھ پر بھی انگور کے چند دانے رکھ دیئے۔ جنہیں میں نے اس زمین کی سب سے بڑی نعمت سمجھ کر کھا لیا۔ زیدی صاحب اب اُونچی آواز میں رُباعیاں اور اشعار پڑھ رہے تھے، یہ سب فارسی میں تھے۔ اُنہوں نے اس خاتون کو بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ میری سمجھ میں یہ سطریں لکھتے ہوئے بھی یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس منظر کو کسی طرح ضابطۂ تحریر میں لاؤں۔ یہ صرف محسوس کرنے والا منظر تھا۔ ایک بھائی بہن کو دلاسہ دے رہا تھا اور وہ ماتمی ماں آہستہ آہستہ قبرستان سے باہر نکل رہی تھی، خاتون اور اس کے

دیگر لواحقین کو گاڑی میں بٹھا کر زیدی صاحب پھر واپس آ گئے۔ ان کا لہجہ بھی گلوگیر تھا اور آنکھیں پُرنم تھیں۔ مَیں دل ہی دل میں زیدی صاحب کو دُعائیں دے رہا تھا کہ اُن کی وجہ سے آج یہ عبادت نصیب ہوئی ورنہ کسے خبر تھی کہ بعض سعادتیں یُوں راہ چلتے بھی مل جایا کرتی ہیں ۔

قبرستان سے واپس ہوئے تو راستہ بھر کسی میں بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دن بھر کی تھکان اور گلستانِ شہدائ کے مناظر متقاضی تھے کہ جی بھر کر رویا جائے مگر ایسی راتیں بار بار کب آتی ہیں چنانچہ ہم سب کافی شاپ میں جا بیٹھے اور ایک بار پھر گفتگو کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب سب کے ذہن میں ایک سوال تھا کہ کل خرم شہر جانا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں منتظمین کو درپیش مسائل بھی سامنے تھے مگر یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ اس سے دستبردار ہونے کو کسی کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کافی پینے کے بعد سب نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی ۔

آج جمعہ کا روز تھا۔ مسٹر رجاوی رات یہ اعلان کر چکے تھے کہ ابھی تک سرحدی علاقوں کے

رہی تھی۔ ہم لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ شاید امریکیوں کو شام کی فلائٹ سے واپس تہران بھیجنے کے بعد یہ لوگ ہمیں خرم شہر لے جائیں گے ۔ اس کے علاوہ آج کے پروگرام میں کچھ اور تاریخی مقامات کی سیر اور جمعہ کی نماز شامل تھی ۔

اصفہان کی سب سے بڑی مسجد جامع جامی ہے۔ ہم لوگ ناشتہ کرنے کے بعد ایک بار پھر بسوں کے اسی قافلے میں سیکورٹی کے ہمراہ اصفہان کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے مسجد جامی پہنچے۔ یہ مسجد اپنے طول و عرض میں اتنی بڑی ہے کہ یہاں ایک وقت میں ۵ لاکھ نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے قبل ہم نے سب سے بڑی مسجد اپنی بادشاہی مسجد سمجھ رکھی تھی مگر مسجد جامی نے ہمیں نہ صرف اپنے طرزِ تعمیر کے حوالے سے متاثر کیا بلکہ اپنی وسعت کا بھی

احساس دلایا۔ اس مسجد کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک بہت بڑے صحن کے علاوہ انتہائی بلند گنبد ہیں جن کو ستونوں کے سہارے کھڑا کیا گیا ہے۔ اور اُستادوں کا کمال یہ ہے کہ صرف اینٹوں سے اینٹیں جوڑ کر یہ گنبد اور محراب بنائے گئے ہیں ۔ یوں ان اینٹوں کی چنائی سے ایسے ایسے خوبصورت ڈیزائن بن گئے ہیں کہ دیکھنے والے کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ مسجد تقریباً ایک ہزار سال قبل تعمیر کی گئی تھی۔ اس حوالے سے اسے دنیا کی قدیم ترین مساجد میں شامل ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس وقت یہ مسجد بنائی گئی تو قبلے کا رُخ متعین نہیں تھا۔ ۹ نویں صدی میں مسجد کے قبلے کا رُخ پہلی مرتبہ درست کیا گیا مگر ۱۱ ویں صدی میں جب سلجوکی ایران میں حکمران بنے تو ایک بار اس کا رُخ درست کیا گیا۔ الزبتھ کا تعلق بھی چونکہ تھوڑا بہت فنِ تعمیر اور قدیم عمارات کی تحقیق کے فن سے ہے اس لیے وہ اس کے طرزِ تعمیر میں خاص دلچسپی لے رہی تھی اس موقع پر صحیح رہنمائی سید گلزار حیدر فرما رہے تھے انہوں نے علم جیومیٹری کی رُو سے مسجد کے گنبدوں کی تعمیر پر روشنی ڈالی اور یہ ثابت کیا کہ اس مسجد کے معمار بہت بڑے جیومیٹری دان بھی تھے۔

ایک موقع پر جب میں نے کوئی وضاحت طلب کی تو زیدی صاحب بولے یہاں

LIVING SCHOOL OF GEOMETRY

یعنی سید گلزار حیدر تمہارے ساتھ کھڑے ہیں ان سے پوچھ لوں اس ضمن میں تمام استفسارات کے جواب گلزار صاحب نے دیئے۔ مسجد میں جمعہ کی نماز کی تیاری ہو رہی تھی۔ صفائی وغیرہ کی جا رہی تھی۔ ہم لوگ مسجد کے مختلف حصّوں میں سے گزر رہے تھے کہ اچانک مجھے پیچھے سے کلمہ پڑھنے کی آواز آئی۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو زیدی صاحب الزبتھ کو کلمہ پڑھا رہے تھے اور الزبتھ بڑے انہماک سے اُن کے ساتھ ساتھ کلمہ دُھرا رہی تھی۔ آپ اس مسجد کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہم پورا آدھ گھنٹہ گھوم کر اس کے مختلف حصّے دیکھ پائے۔ مسجد کے ایک حصّے میں سلائیڈ پروجیکٹر اور سکرین لگی تھی اور نشستوں کا

اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ یہاں محکمہ آثارِ قدیمہ کے لوگوں نے مسجد کا تفصیلی تعارف کروایا۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۸۴ء میں عراقی بمبار طیاروں نے مسجد اور اس سے ملحقہ مارکیٹ پر بمباری کر کے اس تاریخی مسجد کے اس حصّے کو بالکل تباہ کر دیا جس میں اس وقت ہم بیٹھے تھے، انہوں نے بتایا کہ اس حملے میں ۵۰ کے قریب معصوم شہری بھی جاں بحق ہوئے تاہم یہ اہلِ اصفہان کا عزم اور حوصلہ ہے کہ ۱۹۸۴ء کے اس حملے کے ۴ سال بعد مسجد کے اس حصّے کو نئے سرے سے تعمیر کر لیا گیا اور خدا کے فضل سے آج یہ مسجد اپنی تمام تر عظمتوں کے ساتھ موجود ہے، مارکیٹ کی تعمیر بھی مکمل ہو چکی ہے۔ ہمیں سلائیڈوں کے ذریعے مسجد کے اس حصّے پر عراقی جہازوں کی بمباری اور تباہی کے مناظر دکھائے گئے۔ یہ تصاویر دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اَب یہ مسجد کبھی اپنی اصلی حالت میں نہ آسکے گی۔ مسجد کے علاوہ اصفہان شہر کی دیگر تاریخی عمارات اور مکانات پر بمباری سے ہونے والی تباہی کے مناظر بھی تفصیل کے ساتھ دکھلائے گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اصفہان کو یونیسکو نے تاریخی ورثہ قرار دیا ہے اور اس شہر میں تقریباً ۲۰ ہزار عمارتیں ایسی ہیں جو تاریخی اہمیّت کی حامل ہیں۔ ان میں سے ۴۰ عمارتیں مکمل طور پر تباہ کر دی گئیں جبکہ ۵۰ فیصد کو جزوی طور پر نقصان پہنچا۔ عراق نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایران اور عالمِ اسلام کے اس تاریخی ورثے کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی اور ۱۶۰ کے قریب بم اور میزائل اس تاریخی شہر پر پھینکے گئے مسلسل ۴۶ روز اس شہر پر ہوائی حملے ہوتے رہے۔ اور خاص طور پر ہر سال مارچ کے مہینے میں جب ہم اپنے نئے سال کی خوشی منا رہے ہوتے ہیں۔ عراقی حملے ضرور ہوتے۔ اُنہوں نے بتایا کہ ہم نے عالمی فورموں پر دنیا کو بارہا یہ بتایا کہ ہمارا تاریخی ورثہ تباہ کیا جا رہا ہے مگر کسی نے بھی سوائے ہمدردی کے پیغام بھیجنے کے ہماری کوئی مدد نہ کی، گزشتہ برس یونیسکو نے ۴ کے قریب ماہرین اصفہان بھیجے مگر وہ بھی ہمارے ہی خرچ پر یہاں آئے مگر بات کچھ بھی نہ بنی، حملے ہوتے رہے، تباہی ہوتی رہی اور دنیا کا یہ عظیم ثقافتی ورثہ عراقی بمباری کی بربریت کا نشانہ بنتا رہا۔

سلائیڈوں کے ذریعے بعض خوبصورت گھروں اور عزا خانوں کی تباہی کے مناظر بھی دکھائے گئے۔ مندوبین نے اس موقع پر چند سوالات بھی کیے جس پر ہمیں بتایا گیا کہ حکومت لوگوں کے تباہ شدہ مکانات کی تعمیر کے لیے بھی مدد دے رہی ہے۔ مسجد جامی سے باہر نکلے، تو ملحقہ مارکیٹ بھی دیکھی جسے نئے سر سے سے تعمیر کیا گیا تھا اور اب وہاں کاروبار زندگی رواں دواں تھا۔ سڑک پر کھڑی بس میں بیٹھنے لگے تو سامنے ایک تنور دکھائی دیا جس کے باہر ایک ۱۰ فٹ طول و عرض کی روٹی لٹک رہی تھی۔ اس روٹی کا رنگ براؤن تھا اور اس پر خشخاس لگی ہوئی تھی۔ میرا جی للچا گیا۔ میں نے فوراً یہ روٹی خریدنے کا فیصلہ کیا۔ اور جب صاحب دُکان نے ایک کلو روٹی تول کر دی تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ یہ میٹھی روٹی تھی اور انتہائی سستی بھی۔ میں نے بس میں آکر یہ روٹی بسکٹ بسکٹ کی آواز لگا کر سب ساتھیوں میں تقسیم کی جسے سب مزے لے لے کر کھانے لگے۔

میں اس سے پہلے بھی کئی ایک گلیوں کے کنارے رنگ برنگے کاغذوں سے مزیّن الماریوں میں بعض تصاویر دیکھ چکا تھا جس میں رات کو بلب روشن ہوتے۔ یہ تصاویر اُن شہداء کی تھیں جو اس مخصوص گلی یا محلے کے رہائشی تھے۔ مسجد جامی سے نکل کر ایک بڑی سڑک پر پڑے تو ہماری بس مسجد جعفر کے پاس جا رُکی۔ یہ بھی ایک تاریخی مسجد ہے۔ اس کے ساتھ ایک بڑا عزا خانہ ہے۔ اتفاق سے اس وقت عزا خانے میں مجلس بپا تھی۔ باہر صحن میں ایرانی تعزیہ رکھا تھا۔

میں بھی دُرود پڑھتا ہوا عزا خانے میں داخل ہوا۔ یہاں کا منظر بھی دیدنی تھا۔ عزادار ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے، عزا خانے کے ایک کونے میں قہوہ کا کاؤنٹر لگا تھا۔ عزاداروں کے سامنے قہوے کی پیالیاں رکھی تھیں، میں بھی اس مجلس میں شامل ہو گیا۔ ایک قاری صاحب بڑے خوش الحان انداز میں تلاوتِ کلامِ پاک کر رہے تھے۔ میرے سامنے

بھی قہوے کی پیالی رکھی گئی۔ میں نے دیکھا وہاں ایش ٹرے بھی رکھے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں سگریٹ نوشی بھی کی جا سکتی ہے۔ میں نے چند تصاویر بنائیں۔ عزا خانے میں موجود لوگ مجھ سے مصافحہ کر رہے تھے۔ یہ اس برادرانہ رشتے کا اظہار تھا جو ہم سب میں مشترک تھا۔

مسجدِ جعفر سے ہماری منزل آرمینیا کا تاریخی چرچ تھا۔ اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے ایک گلی کی نکڑ پر لگے بورڈ پر نظر پڑی تو اپنا اُردو بازار یاد آیا بورڈ پر لکھا تھا "انجمن خوشنویسانِ اصفہان" ایسے کئی بورڈ اُردو بازار کے گردونواح میں لگے دکھائی دیتے ہیں جیسے مچھلی منڈی میں "اخوّت کتابت" وغیرہ۔ آرمینیا کی تاریخِ عالم میں اپنی ایک جداگانہ حیثیت ہے، یہ مذہب کے اعتبار سے عیسائی ہیں۔ اصفہان میں آرمینیا کے چرچ کی عمارت کا شمار بھی اصفہان کی خوبصورت اور تاریخی عمارات میں ہوتا ہے۔ یہ چرچ ۱۶۰۶ء میں قائم کیا گیا تھا جس میں اس وقت ایک شاندار لائبریری، پبلشنگ ہاؤس اور میوزیم قائم ہے۔ ان لوگوں کو اپنا لٹریچر شائع کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ مڈل ایسٹ میں سب سے پہلا اشاعت گھر ہے اور اس خطے میں آرمینائی زبان میں سب سے پہلی کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع کی گئی تھی۔ آرمینیا کا رسم الخط ۵ ویں صدی میں ایجاد کیا گیا تھا۔ چرچ کی عمارت کے بائیں طرف میوزیم ہال کے باہر آرمینیا کے معروف شاعر GOLDEN POET کی مورتی نصب ہے۔ میوزیم خاصا وسیع و عریض اور نوادرات سے بھرپور ہے۔ اس وقت اصفہان میں بارہ ہزار کے قریب آرمینیائی باشندے آباد ہیں۔ آرمینیا دنیا کی پہلی عیسائی سلطنت ہونے کے ناطے تاریخی اہمیّت رکھتا ہے۔ چرچ کے ایک کونے میں ایک یادگار بنائی گئی ہے۔ یہ یادگار ۱۹۴۵ء میں پہلی عالمی جنگ کے آرمینیا شہیدوں کے نام موسوم ہے۔ چرچ کے فادر کے نمائندے نے بتایا کہ اب تک تقریباً ۵۰ آرمینائی باشندے بھی عراق ایران جنگ میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر چکے ہیں۔ میوزیم میں بائیبل کے قدیم ترین نسخے، حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کئی ایک نوادرات، حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تصاویر اور آرمینیائی بادشاہوں کے مکتوب اور ملبوسات بڑے سلیقے سے سجا

کر رکھے گئے ہیں۔ یہیں ایک نادر چیز حضرت ابراہیمؑ کا تصویری خاکہ ہے جسے ۱۷ ویں صدی میں REAMBRANT نے بنایا تھا، شیشے میں محفوظ ہے، اس کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ اور آرمینیائی حکمرانوں کے مجسمے بھی میوزیم کی زینت ہیں۔ میوزیم کے باہر کاؤنٹر پر ایک خوردبین رکھی تھی جس میں سے آپ بال پر آرمینیائی زبان لکھی ہوئی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ خاصی دلچسپ فنکاری ہے سر کے بال پر لکھے ہوئے الفاظ خوردبین سے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ چرچ میں داخل ہوئے تو صلیب کے علاوہ دیواروں اور چھت پر خوبصورت پینٹنگز لگی تھیں جن میں حضرت عیسیٰؑ کے ریوڑ چرانے سے لے کر مصلوب ہونے تک کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ ترجمان نے بتایا کہ یہ تمام پینٹنگز صرف ۳ آرٹسٹوں کے کسبِ کمال کا نتیجہ ہیں۔ چرچ سے واپس ہوٹل پہنچے تو خبر سب کے لیے اطمینان کا باعث تھی کہ منتظمین کا فوجی حکّام سے رابطہ ہو گیا تھا اور ہم لوگ خرم شہر جا رہے تھے۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

اب جمعہ کی نماز کی تیاری تھی اور ہم لوگ (صرف مسلمان مندوب) جب تیار ہو کر دوبارہ مسجد جامع پہنچے تو گاڑیوں کے لیے پارکنگ ملنا محال تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو جامع مسجد کی جانب رواں تھا، بچے، بوڑھے، جوان اور مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ مردوں سے زیادہ عورتیں نمازِ جمعہ ادا کرنے آ رہی تھیں۔ یہاں دوستی، محبت اور خلوص کے وہ مناظر ناقابلِ فراموش ہیں۔ جب ہمیں دیکھ کر لوگ اس طرح ہمارے ساتھ مصافحہ کر رہے تھے، جیسے ہم کوئی پیر نما شے ہوں۔

آپ خود اندازہ لگائیے کہ ۴ لاکھ کے قریب افراد کا مجمع نماز ادا کر رہا ہو تو کیا منظر ہوگا۔ فیض مصطفےٰ اور عبدالکریم اس قدر متاثر دکھائی دیتے تھے کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ نماز کے بعد ایک بار پھر ہجوم ہمارے گرد اکٹھا ہو گیا۔ اُدھر زیدی صاحب جہاد میں مصروف تھے۔ انھوں نے پچاس ساٹھ بچوں کو جن کی عمریں ۷ سے ۱۲ برس کے درمیان تھیں۔ ایک جگہ جمع کر رکھا تھا اور اُن سے فارسی میں خطاب کر رہے تھے، بچے اُن کی تقریر کے دوران نعرے بلند کرتے اور

خوشی سے تالیاں بجاتے۔ زیدی صاحب نے اپنے خطاب کے اختتام پر اُن سے ایک ایسا وعدہ لیا جو زیدی صاحب کے مطابق جہاد ہی کا ایک حصّہ تھا۔ انہوں نے ان بچوں سے ہاتھ اُٹھوا کر یہ وعدہ لیا کہ ابھی وہ مزید ۱۵ برس تک پڑھیں گے، اپنا مستقبل بنائیں گے اور کسی مقام پر پہنچ کر اگر اُنہیں اس سرزمین پر کوئی امریکی استحصال کرتا ہوا دکھائی دیا تو اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ان بچّوں نے زیدی صاحب سے اس بات کا وعدہ کیا اور تالیاں بجاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ لوگوں کا ایک اژدہام تھا مگر تنظیم کا یہ عالم تھا کہ کہیں بھی کوئی افراتفری نہیں تھی، کوئی ہڑبونگ نہیں تھا۔ لوگ جس سلیقے سے آئے اُسی سلیقے سے واپس جا رہے تھے۔ نظم و ضبط کا ایسا مظاہرہ زندگی میں کم ہی دیکھنے کو ملا ہے۔

مسٹر رجاوی نے بتایا کہ ہم لوگ خرم شہر اور اس کے بعد اہواز جائیں گے جہاں ایک رات قیام ہوگا اور اگلے روز تہران واپس پہنچیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ سلسلہ بڑی مشکل سے قائم ہوا ہے اور مندوبین کی شدید خواہش کے پیشِ نظر معاملہ طے کرنا پڑا ہے۔ ورنہ اُب کوئی اُمید باقی نہیں رہی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی اپنا بوریا بستر سمیٹا اور جانے کی تیاری کرنے لگے۔ سب سے پہلے ہمیں "اُمیدیہ" ایئرپورٹ لے جایا گیا۔ یہ ایک فوجی ہوائی اڈہ تھا یہاں فوجی حکّام نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ یہاں ہمیں ایک سی ۱۳۰ فوجی طیّارے میں بٹھایا گیا۔ جہاز نے پرواز کی تو ڈاکٹر حسنات نے میری توجہ جہاز کے پروں کی طرف مبذول کرائی۔ دونوں پروں پر میزائل نصب تھے، بہرحال یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔ "اُمیدیہ ایئرپورٹ سے ہمارا جہاز اصفہان کے پہاڑی راستوں کے اُوپر سے ہوتا ہوا، خُرم شہر پہنچا۔ شہر کی تباہی کا منظر جہاز ہی سے دکھائی دیتا تھا۔ جہاز کے ایئرپورٹ پر اُترتے ہی سکون کا سانس لیا۔ مجھے سارا راستہ پروں پر لگے میزائلوں نے پریشان رکھا تھا، کمپیوٹر بھی تو غلطی کر سکتا ہے۔ خرم شہر کے درمیان میں سے ہماری بسیں گزر رہی تھیں اور کئی ایک مقامات پر بسوں کو روک کر ہمیں بربادی کے مناظر بھی قریب سے دکھائے گئے۔ یہ شہر سٹالن گراڈ کی یاد تازہ کر رہا تھا، شاید ہی کوئی عمارت ایسی ہو

جس کا کوئی حصہ تباہ نہ ہوا ہو، میرے خدا ایک ہنستا بستا شہر کس طرح اجڑا، کسی کا دروازہ غائب تو کسی کی کھڑکی، کہیں دیوار نہیں تو کہیں چھت اُڑی ہوئی ہے۔ یہ مناظر عراق کے جنگی جرائم کو واضح کرنے کے لیے کافی تھے۔ یہی وہ شہر ہے جس کو ایرانی فوج نے عراقیوں کے قبضے سے آزاد کرایا تھا اور جس میں ایک ہی وقت میں ۲۵ ہزار عراقی فوجیوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔ پورا راستہ تقریباً ہر سو میٹر کے فاصلے پر تیل کا کنواں بھی دکھائی دیا جس میں گیس کا روایتی شعلہ روشن تھا۔ اس سے اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ جنگ بند ہونے کی دیر ہے۔ تیل اتنا ہے کہ یہ لوگ چند ہی برس میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ خرم شہر کی بربادی کا نظارہ کرتے ہوئے اہواز پہنچے، یہ شہر دریا کے کنارے آباد ہے۔ اور یہاں خرم شہر کے مقابلے میں زندگی بھرپور انداز میں رواں دواں تھی۔ یہاں کا موسم خاصا گرم اور یہاں تک کہ دریا کا پانی بھی گرم تھا۔ شام ہو چلی تھی اور ہمیں خاص طور پر یہ تاکید کی گئی تھی کہ چونکہ اس شہر میں قربان ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لہٰذا جذبات کا عالم بھی شدید ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ رات کو ہوٹل کے کمرے ہی میں قیام کیا جائے اور کمرے سے باہر نہ نکلا جائے ورنہ کوئی غیر متوقع صُورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔

اہواز شہر ایک گنجان آباد علاقہ ہے۔ جہاں زیادہ تر تیل کے کنوؤں اور ریفائنریوں میں کام کرنے والے لوگ آباد ہیں۔ عمارات خاصی قدیم اور لوگ جفاکش دکھائی دیتے ہیں۔ شہر کو صرف بس میں بیٹھ کر ہی دیکھ پائے تھے۔ یوں بھی ایک انجانا سا خوف تھا۔ بارہا دل میں آئی کہ کاش امریکی ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم آزادی سے گھوم پھر کر یہ علاقے دیکھتے، مگر مجبوری تھی اور مہمان نوازی کا تقاضا بھی کہ مہمان اگر دشمن بھی ہو تو اس کی عزت اور زندگی کی حفاظت کی جائے۔ کھانے پینے کی عادات تمام ایرانیوں کی ایک جیسی ہیں۔

مَیں نے واپسی پر محسوس کیا کہ ہمیں یہ شہر دکھا تو دیئے گئے مگر محاذِ جنگ پر لے جانا شاید ان کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔

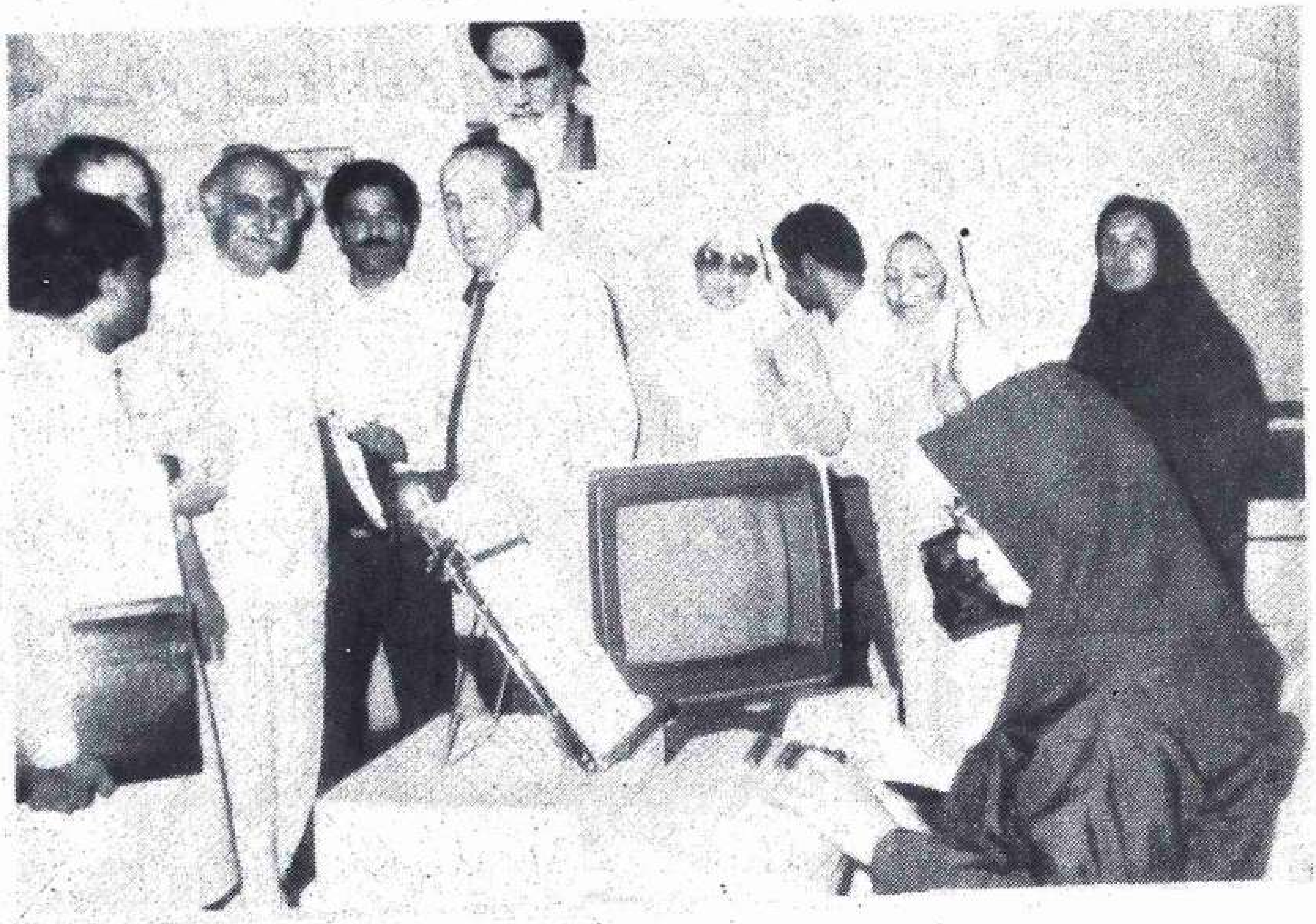

روزنامہ اطلاعات کے کمپیوٹر کمپوزنگ سیکشن میں

مقدّس سفر

بچپن اور پھر شعوری زندگی کے آغاز سے لے کر اَب تک روزمرّہ زندگی میں ایک ایسی قوّت کو ہمیشہ اپنے ساتھ پایا ہے کہ جس کے تصوّر ہی سے حوصلے قوی ہوتے ہیں اور ارادے مضبوط تر ہو جاتے ہیں، صبح گھر سے نکلتے ہوئے بچپن ہی سے ایک دُعا نے ہمیشہ ساتھ دیا ہے اور یہ سلسلہ بفضلِ تعالیٰ آج بھی جاری ہے۔ میری سو برس کے قریب عمر رسیدہ دادی ماں ہمیشہ یہی دُعا دیتی ہیں جاؤ بیٹا تمہیں امام ضامنؑ کی امان میں دیا۔ خاص طور پر امتحان میں بیٹھتے ہوئے سفر پر جاتے ہوئے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دُلہا بنتے ہوئے بھی میرے دائیں بازو پر سُرخ اور سبز کپڑے میں امام ضامنؑ کے نام کی نیاز کا سوا روپیہ باندھا گیا تھا۔ امامؑ ضامن کا اس نیاز کی ہماری مذہبی روایات و رسومات میں اسقدر اہمیت ہے کہ قدم قدم پر امامؑ ضامن کی ہی امان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بچپن ہی سے سُنتے آرہے تھے کہ مشہد ایک شہر ہے جو ایران میں واقع ہے اور ہمارے یہ امامؑ جن کے نام کو زندگی کی راہ میں، مشکل وقت میں، امتحان کی گھڑی میں کامیابی کا ضامن ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس شہر میں اُن کا عظیم الشّان روضہ واقع ہے۔ میرے ایک دوست نے ایک مرتبہ بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ یار شیعوں کے تو بچّے بھی اپنے عقائد کے معاملے میں بڑے پختہ ہوتے ہیں اُنہیں دوسروں کی نسبت نہ صرف اپنے عقائد کا شعور ہوتا ہے

بلکہ وہ بہت معلومات بھی رکھتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ اُن کی نظر میں یہ تھی کہ انہیں بچپن ہی سے لازمی طور پر مجالس میں جانے اور فضائل و مصائب اہل بیتؑ کے علاوہ قرآن کی آیات کی تفسیر، فقہ کی باتیں، تاریخ اور دیگر اہم موضوعات پر علماء کی تقاریر سُننے کا ذوق ہوتا ہے انہیں اور کسی بات کا علم ہو یا نہ ہو اتنا پتہ ضرور ہوتا ہے کہ اُن کے کس امام کو کہاں اور کس طرح شہید کیا گیا اور اُن کا روضہ کہاں ہے؟ شیعوں کی تعداد میں روز بروز اضافے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ایک تسلسل اور سلیقے کے ساتھ اپنے آئمہؑ کی ولادت اور شہادت کے دن مناتے ہیں اور ان تمام رسومات کو منانے میں اُن کا خلوصِ نیت اور جذبۂ ایمانی کارفرما ہوتا ہے۔ آج میرے لیے یہ بڑا سعادت کا دن تھا کہ میں اپنے اسی ضامن امامؑ کے روضے کی زیارت کے لیے مشہد جا رہا تھا۔ آج قلب و جگر کی عجیب کیفیت تھی۔ ذہن سے سارے بوجھ اُتر چکے تھے اور اِس مقدس سفر کو مَیں نے اسی لیے اپنے قیام کا آخری مرحلہ ٹھہرایا تھا کہ اطمینان اور سکون کے ساتھ ان زیارات سے مستفید ہو سکوں۔ جہاز کا واپسی ٹکٹ میں نے پہلے ہی خرید لیا تھا۔ مشہد کے لیے تہران سے روزانہ صبح ۸ بجے ایک فلائٹ جاتی ہے۔

کرنل صاحب نے بتایا تھا کہ مشہد میں آج کل موسم زیادہ خنک ہو گا اس لیے گرم کپڑوں کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ مَیں نے ایران میں قیام کے دوران پہلی مرتبہ شلوار قمیض کے بجائے پتلون اور کوٹ پہنا، یہ رات بھی عجیب رات تھی جسے شاید میں ساری زندگی نہ بھلا سکوں یُوں تو میں نے ویٹر کو صبح ۵ بجے ناشتے کے بہانے جگانے کا کہہ دیا تھا اور آپریٹر سے بھی درخواست کر دی تھی مگر بے چینی کی ایک عجیب کیفیت تھی، ساری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی دوست احباب اور رشتہ داروں کی دعاؤں کی فرمائشیں یاد آ رہی تھیں اور کبھی یہ تصور ہی بے چین کر دیتا تھا کہ صبح میں امامؑ کے روضے پر حاضر ہوں گا اور وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا، جس کا تصور ایک عمر سے میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ رات کیسے گزری، مجھے اس کے بارے

میں کچھ علم نہیں ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ جب ویٹر نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اس وقت میں جاگ رہا تھا۔ کپڑے تبدیل کیے، ناشتہ کیا۔ اِس سفر کے لیے بیگ پہلے ہی سے تیار کر لیا تھا۔ لابی میں پہنچا تو ایران ایئر کا وہی مستعد نوجوان کئی ملکی مہمانوں سے اُن کے پاسپورٹ وغیرہ وصول کر رہا تھا۔ یہاں فیض مصطفےٰ بھی تھے جو سری لنکا واپس جا رہے تھے۔ برطانوی جرمن اور کینیڈا سے آئے ہوئے دوست بھی روانگی کے لیے تیار کھڑے تھے۔ فیض مصطفےٰ بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے۔ سری لنکا ضرور آیئے گا۔ اُن کے ساتھ گزشتہ روز ایک دوسرا معاملہ ہو گیا تھا۔ وہ جلدی میں اصفہان کے ہوٹل میں اپنا کوٹ بھول آئے تھے جس میں اُن کی عینک بھی تھی۔ اب اُن کی پریشانی کوٹ سے زیادہ عینک کے لیے تھی تاہم مسٹر رجاوی نے اُنہیں یقین دلایا تھا کہ اُنھوں نے اصفہان بات کی ہے۔ کوٹ محفوظ ہے البتہ اگلے روز آئے گا اور جونہی وہ ہمیں موصول ہوگا۔ ہم بحفاظت سری لنکا پہنچا دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ یہ مشورہ بھی دے رہے تھے کہ اگر آپ چاہیں تو اپنا قیام ایک روز اور بڑھا دیں کل صبح تک آپ کی اشیاء آپ کو مل جائیں گی مگر فیض مصطفےٰ کے لیے شاید بچوں سے ایک روز کی جُدائی بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ تمام مہمان لابی میں جمع ہو چکے تھے۔ ان سب کی منزل ظاہر ہے کہ ایئر پورٹ ہی تھی۔ چنانچہ اب ایئر پورٹ جانے کے لیے ٹیکسی کے تردّد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ ایئر پورٹ پر کسی مسئلے کا سامنا نہیں ہوگا اور جہاز تک اطمینان سے پہنچ جاؤں گا۔ کانفرنس کے منتظمین نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ دورانِ سفر کانفرنس کا نشان کوٹ پر سجائے رکھوں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایئر پورٹ پر بورڈنگ کارڈ سے لے کر چیک اِن تک ایران ایئر والے نوجوان نے نہ صرف میری راہنمائی کی بلکہ وی آئی پی گیٹ سے خصوصی کار کے ذریعے مجھے جہاز کی سیڑھیوں تک پہنچایا۔ یہ بھی بوئنگ ۷۴۷ کی فلائٹ تھی۔ جہاز مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمیں چائے اور بن پیش کیے گئے۔

جہاز ٹھیک دس بجے مشہد ایئرپورٹ پر اُترا۔ یہاں کا موسم ہمارے ہاں کے اکتوبر کے آخری ہفتے کا موسم تھا۔ ہلکی دھوپ، قدرے خنکی، یہ تبدیلی بہت بھلی لگی۔ مشہد ایئرپورٹ پر سواری کا ایک بہترین نظام قائم کیا گیا ہے۔ آپ ایئرپورٹ سے باہر پرائیویٹ ٹیکسی کاؤنٹر پر ۶۰ تومان جمع کرائیں۔ وہاں سے ٹیکسی کے نمبر کا ٹوکن ملے گا۔ میں نے بھی وہ ٹوکن حاصل کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑھ کر میرا بیگ مجھ سے لے لیا اور اب میں اُس سرزمین پر تھا جس کو چھُونے کے خواب ہمارے ہاں دیکھے جاتے ہیں۔ تہران میں اپنے ہوٹل کے استقبالیہ کلرک سے میں نے روانگی سے پہلے مشہد کے ہوٹلوں کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ ان معلومات کے مطابق وہاں بھی حیات ریجنسی بنایا گیا تھا جسے اب ہوٹل ھُما کا نام دیا گیا ہے۔ ٹیکسی صاف شفاف سڑکوں سے گزرتی ہوئی مشہد شہر میں داخل ہوئی۔ یہ شہر بھی ایران کے دیگر شہروں کی طرح بلند و بالا اور خوبصورت عمارتوں پر مشتمل ہے۔ شہر میں گہما گہمی بھی خوب تھی۔ آج محرم الحرام کا چاند بھی متوقع تھا۔ اس لیے زائرین کی ایک بڑی تعداد بھی شہرِ امامؑ میں تھی۔ ٹیکسی ہوٹل ھُما پہنچی مگر استقبالیہ پر عجب صُورتِ حال کا سامنا تھا۔ ہوٹل میں بقول شخصے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ استقبالیہ کلرک نے مجُھ سے کہا کہ آپ سے غلطی ہوگئی۔ اگر آپ تہران سے فون پر ریزرویشن کرا لیتے تو شاید آپ کا کام بن جاتا ہے۔ میں آپ کو دوسرے ہوٹلوں کے نام بتا دیتا ہوں۔ آپ وہاں ٹرائی کر لیں ویسے میرے خیال میں ان دنوں یہاں ہوٹل میں کمرہ لینا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ استقبالیہ کلرک نے مجھے ہوٹل جم، ہوٹل صدر اور ایران ہوٹل کے نام بتائے۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ مجھے ٹیکسی دلوا دے تاکہ میں کسی منزل تک پہنچ سکوں۔ اس نے میرے لیے ہوٹل کے ایک ٹیکسی کاؤنٹر سے میرے لیے ٹیکسی کا بندوبست کیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس خصوصی تردّد میں کانفرنس کے اس نشان کا بڑا ہاتھ تھا جو ابھی تک میرے کوٹ پر سجا ہوا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ وہ مجھے باری باری ان تینوں ہوٹلوں پر لے گیا مگر کہیں بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ڈرائیور اپنے طور پر

مجھے ہوٹل اطلس، اردک، حافظ اور دیگر کئی چھوٹے موٹے ہوٹلوں پر بھی لے گیا مگر کہیں بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر ہوٹل میں لوگ بیوی بچوں سمیت قیام پذیر تھے۔ یہ صورتِ حال خاصی پریشان کُن تھی۔ ایک تو رات بھر کا جاگا ہوا اور اب بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ امامؑ کا روضہ مشہد کے وسط میں واقع ہے۔ روضہ کے سامنے والے چوک سے کئی بار گزرا، اطلس گنبد صاف دکھائی دے رہے تھے۔ درود و سلام پڑھتا ہوا ہوٹل کے کمرے کی تلاش میں مصروف تھا مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ مختلف ہوٹلوں کے چکر لگاتا ہوا ایک بار پھر ایران ہوٹل پہنچا ذہن میں یہ تھا کہ یہاں کھانا وغیرہ کھا کر پھر سے تلاش میں نکلوں گا۔ شاہراہِ امامؑ سے کئی بار گُزر ہو چکا تھا اور اَب ہوٹل سے روضۂ امامؑ کا راستہ مجھے زبانی یاد ہو چکا تھا۔ ہوٹل ایران کے کاؤنٹر کے ساتھ بیگ رکھا اور استقبالیہ کلرک سے ایک بار پھر کمرے کے لیے درخواست کی

یہاں ایک اور ہی مسئلے کا سامنا تھا۔ استقبالیہ کلرک فارسی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ مشہد ایک اہم شہر ہے جہاں دُنیا بھر سے زائرین بڑی تعداد میں آتے ہیں اور زائرین کی آمد کا یہ سلسلہ سارا سال جاری رہتا ہے۔ تھوڑی بہت انگریزی سمجھنے والا تو ہونا چاہیئے۔ میں اس کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مَیں حکومتِ ایران کا مہمان ہوں، صحافی ہوں، صرف ایک رات کے لیے ٹھہرنا ہے۔ کسی چھوٹے موٹے کمرے کا بندوبست کر دو مگر وہ میری باتوں کے جواب میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کر رہا تھا۔ کاؤنٹر پر کھڑے ایک صاحب نے میری مشکل کو سمجھ لیا تھا۔ گو میری ساری باتیں اُن کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگے یہاں کمرے کا حصول بغیر پیشگی بکنگ کے بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے

۲ بجے ہوٹل کا چیک آؤٹ ٹائم ہے۔ میں بھی کمرہ چھوڑ رہا ہوں۔ انتظار کیجیے شاید کوئی کمرہ مل جائے۔ میں نے کہا بھائی خدا تمہارا بھلا کرے۔ ساری رات کا جاگا ہوا ہوں اتنے شوق سے امامؑ کے روضے کی زیارت کے لیے آیا ہوں۔ براہِ کرم میری مشکل ان کی زبان میں ان تک پہنچا دیجئے۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ وہ صاحب فارسی میں استقبالیہ کلرک

سے میرا تعارف کرانے لگے۔ استقبالیہ کلرک اُن کی باتیں سُن کر یُوں ہنس رہا تھا جیسے مجھے اَن پڑھ جاہل سمجھ رہا ہو۔ بھلا وہ صحافی یا دانشور کیسے ہوسکتا ہے جسے فارسی نہ آتی ہو، میں ان دونوں کی گفتگو سے یہی اندازہ لگا سکا اور پھر جب اُن صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے ایک اَن پڑھ شخص سمجھ رہا ہے اور میرے دعوئ صحافت کو محض مذاق اور کُھلم کُھلا جھُوٹ سمجھ رہا ہے۔ اسی لمحے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ وطن واپس جاتے ہی لاہور کے خانۂ فرہنگِ ایران میں ہونے والی فارسی کلاس میں داخلہ لوں گا اور اپنی پہلی فرصت میں فارسی سیکھ کر دوبارہ مشہد آؤں گا اور اس بے وقوف آدمی سے فر فر فارسی میں باتیں کرکے اس کو حیران کر دوں گا مگر یہاں مسئلہ قابلیت کے مظاہرے کے بجائے کمرے کے حصول کا تھا۔ ہمارے ساتھ ہی ایک فرینچ کٹ داڑھی والے گول مٹول سے ایرانی بھی کھڑے تھے۔ اُنہوں نے بھی میری مدد کی اور استقبالیہ کلرک کو یہ یقین دلانے لگے کہ میں واقعی ایک معزز مہمان ہوں اور اگر مجھے اکموڈیٹ نہ کیا گیا تو ایرانیوں میں جذبۂ مہمان نوازی کی نفی ہو جائے گی مگر وہ استقبالیہ کلرک نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ہوٹل کی مختصر سی لابی میں اور بھی بہت سے لوگ شاید کمروں ہی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فرینچ کٹ والے صاحب کی باتوں نے مجھے کچھ حوصلہ دیا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا۔ اُنہوں نے بتایا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے انجنیئر ہیں۔ اور مصطفٰے علی بابا اُن کا نام ہے۔ وہ اپنی بیگم اور تین بیٹیوں کے ہمراہ کمرے ہی کے چکّر میں تھے مگر شاید اُن کی بکنگ موجود تھی۔ تقریباً پون گھنٹے کی منت سماجت کے بعد استقبالیہ کلرک اس بات پر راضی ہوا کہ میرا پاسپورٹ لے لیا اور اس کے اوراق اُلٹنے لگا۔ اب اس نے ایک فارم میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ غیر ملکیوں کے لیے تھا۔ علی بابا کی مدد سے میں نے وہ فارم بھرا۔ اب استقبالیہ کلرک صاحب کا حکم تھا کہ انتظار کریں جب بھی کوئی کمرہ خالی ہوگا آپ کو دے دیا جائے گا۔ گویا یہ ایک قسم کی بکنگ تھی جس کا کنفرم ہونا قسمت پر منحصر تھا۔ میری بھُوک اور نیند کے مارے بُری حالت ہو رہی تھی۔ ریسٹورانٹ کھُل چکا تھا اور میں پہلا مسافر تھا جس نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا

کھانے کے بعد میں کافی شاپ میں آگیا۔ وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اور حالت یہ تھی کہ سر میں شدید درد اور ایک ایک جزوِ بدن دُکھ رہا تھا۔

اَب علی بابا بھی میرے پاس آگئے۔ کافی شاپ میں بیٹھے ہم تفصیلی تعارف میں مصروف تھے۔ علی بابا نے ۵ برس انگلستان میں نوکری کی ہے اور اِن دِنوں تہران کی کسی تعمیراتی فرم میں ملازمت کرتے ہیں۔ وہ جنگ کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال سے خاصے پریشان تھے اور اُنہیں زیادہ پریشانی اِس بات پر تھی کہ یہ جنگ کبھی بند نہ ہوگی اور یوں معمولاتِ زندگی اسی طرح رہیں گے۔ علی بابا نے میرا تعارف اپنی بیگم سے بھی کرایا اور میں اپنے ایران میں قیام کے دوران کسی ایرانی خاتون سے پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر متعارف ہوا۔ اُن کے تینوں بیٹے بھی خاصے شرارتی تھے۔ ایک موقع پر مجھے کہنا پڑا، علی بابا آپ کے تینوں "چور" بہت تیز ہیں۔ آپ کو مزید ۳۷ کی ضرورت ہی نہیں۔

علی بابا کے والد کا شمار تہران کے صاحبِ ثروت لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ چند ہی لمحوں میں میرے ساتھ اس طرح گھل مل گئے کہ اجنبیت کا سارا احساس جاتا رہا اور میری تھکن خاصی حد تک دُور ہوگئی۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کا ایک بڑا مکان سمندر کے کنارے بھی واقع ہے۔ وہ مجھے بار بار چند دن اور رُکنے کے لیے کہہ رہے تھے اور اُن کا اصرار تھا کہ اگلی مرتبہ جب بھی مَیں ایران آؤں بیوی بچّوں کو لے کر آؤں اور اُن کا مہمان بنوں۔ شوگر کیوب کو منہ میں ڈال کر چائے کے گھونٹ بھرنا شاید ان کی عادت تھی اور یُوں میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کم سے کم روزانہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ چینی چائے کے ساتھ ہی کھا جاتے ہیں۔

میری حالت کچھ یوں تھی کہ مَیں کبھی صوفے پر ٹانگیں پسارتا، کبھی سَر کو صوفے کی پُشت پر لٹکاتا۔ آنکھیں نیند سے سُرخ ہو رہی تھیں مگر کمرے والا معاملہ ابھی جُوں کا تُوں تھا۔ خُدا خُدا کر کے دو بج ہی گئے۔ علی بابا کو کمرہ مل گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر استقبالیہ سے میری سفارش کر رہے تھے۔ بہت سے مسافر سیڑھیاں اُتر رہے تھے، مجھے حوصلہ ہوا کہ شاید اب کام بن جائے۔ اتنے میں ایک دراز قد بڑی بڑی مونچھوں والا شخص لابی میں آیا۔ استقبالیہ کلرک

نے علی بابا کو کچھ بتایا۔ علی بابا کا کہنا تھا کہ یہ اس ہوٹل کا مینجر ہے اور مالک بھی، اس سے بات کرنی چاہیئے۔

مَیں نے اپنی "رُودادِ غم" اس کو بھی سنائی مگر شاید وہ بھی استقبالیہ کلرک کے "ماتحت" تھا مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص عقیدہ کے لحاظ سے نُصیری ہے۔ نُصیری وہ لوگ جو نعوذ باللہ حضرت علیؑ کو خدا مانتے ہیں۔ یہ لوگ اب برملا اس کا اظہار نہیں کرتے کیونکہ حکومت ان کا سختی سے نوٹس لیتی ہے۔ اور جس طرح بہائی عقیدے کے لوگوں کو ایران سے نکال دیا گیا ہے اس طرح یہ لوگ بھی زیرِ عتاب ہیں اس لیے اب اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے۔

علی بابا اپنے کمرے کا نمبر مجھے بتا کر اُوپر چلے گئے تھے اور اَب میں عین استقبالیہ کے سامنے پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھا۔ اس کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے قبضہ قدرت میں ہوٹل کے تمام کمروں کی چابیاں تھیں۔ اس انتظار میں ۳ بج گئے، لوگ ابھی تک آجا رہے تھے مگر میرے اُس بھائی کی نظروں میں میرے لیے کوئی ہمدردی دکھائی نہ دیتی تھی جس کی زبان نہ جاننا میرے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ بار بار چائے پینے اور انتظار کی طویل گھڑیاں گزارتے۔ بالآخر ساڑھے چار کا عمل ہو گیا۔ اَب میرا بلڈ پریشر بھی خراب ہونے لگا تھا۔ وہ محبت جو میرے دل میں ان لوگوں کے لیے پہلے دن ہی گھر کر گئی تھی۔ آہستہ آہستہ کافور ہونے لگی اور بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ بیگ اُٹھا کر سیدھا حرمِ امامؑ چلتا ہوں وہیں کسی کونے میں پڑا رہوں گا۔ جن کے شہر میں مہمان ہوں وہ خود ہی جانیں۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میں تقریباً ۱۶ ویں مرتبہ کاؤنٹر پر آیا۔ استقبالیہ کلرک حسبِ معمول مُسکرا رہا تھا۔ مجھے اس کا یہ مسکراہٹ زہر لگی۔ میں نے کہا:

"یہ مشہد ہے یا کربلا مجھے ترسا ترسا کر کیوں مارنا چاہتے ہو، براہِ کرم میرا پاسپورٹ واپس کر دو، مَیں جا رہا ہوں۔" میرے ان فقروں کا شاید استقبالیہ کے پیچھے بیٹھے ٹیلیفون آپریٹر کو آ گئی تھی۔ اس کا فوری ردِّ عمل یہ ہوا کہ موصوف نے ایک کمرے کی چابی میرے سامنے

رکھ دی اور ایک اور کاغذ پر دستخط کروا کر مجھے لفٹ کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ پہلے ہی یہ فقرہ کیوں نہ کہہ دیا۔ بہرحال خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور سامان اُٹھا کر کمرے میں چلا گیا۔ کمرہ اپنے ہاں کے اسٹیشن برانڈ ہوٹلوں کے کمرے جیسا تھا۔ سیلن کی بدبو نمایاں تھی تاہم کمبل بالکل صاف ستھرے، بستر نئے اور ایئرکنڈیشنر زبردست طاقتور تھا۔ میں نے فوراً سامان رکھا، کمرہ لاک کیا اور اپنے سفر کے دوران پہلی مرتبہ LAXOTNIL کی گولی کھا کر لیٹا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ علی بابا خیریت پوچھ رہے تھے وہ خوش تھے کہ مجھے بھی کمرہ مل گیا تھا، اُنہوں نے شام کا پروگرام پوچھا میں نے کہا: بھائی ایک گھنٹہ کمر سیدھی کر لینے دو۔ ساڑھے پانچ بجے ہوٹل سے نکلیں گے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ روضۂ امامؑ کی زیارت کے لیے اکٹھے نکلیں گے۔

میں سکون آور گولی کھا کر سویا تھا مگر ٹھیک سوا پانچ بجے مجھے یوں لگا جیسے میرا بیٹا حسن جسے ہم پیار سے سنّی کہتے ہیں بستر سے گر گیا ہو، میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا، مجھے بیٹے کے رونے کی آواز نے جگایا تھا۔ یہ قصہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے فوراً غسل کیا، کپڑے بدلے اور لابی میں پہنچ گیا۔ علی بابا معہ اپنے "تین چوروں" اور زوجہ کے میرے منتظر تھے۔ میں دل ہی دل میں درود پڑھتا ہوا، روضۂ امامؑ کی طرف روانہ ہوا۔ جو ہوٹل ایران سے تقریباً ۳ فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ شاہراہِ امامؑ پر خاصا رش تھا۔ چوک سے امامؑ کے روضے کے گنبد دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب میوہ جات ملبوسات اور دیگر سٹور خاصی تعداد میں ہیں۔ ٹھیلے بھی لگے تھے اور فٹ پاتھ پر تسبیح سجدہ گاہیں بچوں کے ملبوسات، جوتے اور دیگر ساز و سامان رکھے۔ پھیری والے آوازیں لگانے میں مصروف تھے۔ حرم امامؑ سے پہلے ایک کھلا میدان ہے جس سے آگے گاڑیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس میدان کے دائیں ہاتھ ایک بہت بڑا بینر لگا تھا جس میں فارسی میں لکھا تھا

"ہم اہلِ کوفہ نہیں کہ اپنے امام کا ساتھ چھوڑ دیں۔"

ہم جونہی روضۂ امامؑ کی حدود میں داخل ہوئے مغرب کی اذان ہونے لگی۔ حرم امامؑ کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہی نماز کے لیے صفیں باندھی جا رہی تھیں۔ میں بھاگم بھاگ ایک صف میں کھڑا ہو گیا۔ اِس طویل و عریض صحن میں نماز مغربین ادا کرنے کا اپنا ہی لطف تھا۔

حرم میں داخل ہونے سے پہلے میرے ذہن میں بالکل ایسا نقشہ نہیں تھا۔ یہاں لوگوں کا اتنا بڑا ہجوم تھا کہ گنتی کرنا مشکل ہے۔ چاروں طرف مرد، عورتیں اور بچّے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی کونے میں کچھ لوگ کمبل اوڑھے بھی لیٹے تھے۔ علی بابا کی بیگم اور بچّے بھی ایک دیوار کے ساتھ بیٹھ گئے۔ علی بابا نے اپنے جُوتے اُتار کر وہیں رکھ دیئے تھے۔ مَیں ایسا کرتے ہوئے قدرے جھجک رہا تھا جسے علی بابا نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اُنھوں نے مجھ سے بھی کہا کہ میں اپنے جُوتے وہیں رکھ دوں۔ اندر بہت رش ہے۔ ابھی ہم ہو کر آتے ہیں۔ بچّوں کو صبح زیارت کرا دوں گا۔ چنانچہ میں نے اپنے جُوتے وہیں رکھ دیئے۔

حرم میں نماز کے بعد اجتماعی دُعا بھی ہوئی - بڑے صحن سے گزر کر ایک اور صحن پھر ایک اور صحن اور خلقِ خدا کا یہ عالم تھا کہ ٹُوٹی پڑ رہی تھی۔ امامؑ کے روضے کی حدود میں داخل ہوتے ہی آنکھیں چھلک پڑیں۔ کیسے کیسے منظر یاد آئے، وہ جو بچپن سے سُنتے آئے تھے، وہ جو تاریخ میں رقم ہو چکا ہے، وہ مظالم جو بنو اُمیہ اور بنو عباس نے اہلِ بیتؑ کے ساتھ روا کیے۔ تاریخ اسلام کا ایک ایک ورق ذہن میں گھومنے لگا۔ کون امامؑ ہے جسے طبعی رحلت نصیب ہوئی ہو، کسی کو زہر دے کر مارا، کوئی فرات کے کنارے پیاسا مارا گیا، کسی کے حصّے میں زنجیریں آئیں اور کوئی بندی خانوں میں جوانی گزار گیا۔ کیا زہر اور تلوار ہی خانوادۂ رسولؐ کا مقدّر تھا؟

امامؑ کے روضے کی حدود میں داخل ہوتے ہی معصومہ قمؑ یاد آئیں۔ امامؑ کی یہ بہن اپنے بھائی کی تلاش میں ہزاروں میل کا سفر کر کے جنگلوں اور پہاڑوں کے دشوار راستوں سے گزرتے ہوئے یہاں پہنچیں تھیں۔ او میرے خدایا، اہلِ بیتؑ کے یہی مصائب اُن کی عظمتِ

کردار کا حصّہ بن چکے ہیں۔ علی بابا میری توجہ بار بار چھتوں، دیواروں، سونے کے دروازوں، فانوسوں اور فرشوں کی طرف مبذول کرا رہا تھا مگر ابھی عمارت کے آرکیٹیکچر کو دیکھنے کا ہوش کسے تھا

سیّد افضل حیدر نے مجھے بتایا تھا کہ امامؑ کے روضے پر مانگی جانے والی پہلی چار دعاؤں کو شرفِ قبولیت ضرور حاصل ہوتا ہے۔ میں یہاں صرف دو دعاؤں کا تذکرہ کروں گا۔ پہلی دُعا دوست احباب، رشتہ داروں اور عقیدت مندوں کی تمام طرح حاجات اور دُعاؤں کی قبولیت کی تھی جن کے لیے مجھے فرداً فرداً سب نے کہا تھا، دوسری دُعا میں مَیں نے اپنے بچوں، بھائی بہنوں، گھر بار، والدین، عزت آبرو، جان و مال کو امامِ ضامنؑ کی امان میں دیا۔ آنسوؤں کی جھڑی تھی کہ رُکنے کا نام نہ لیتی تھی اور رش کا یہ عالم تھا کہ مجھے حج کے دوران کا واقعہ یاد آ گیا۔ ۱۹۸۳ء میں جمعہ کا حج تھا جسے حج اکبر کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی خدا کے فضل سے ایک خوبصورت اتفاق تھا کہ مجھے حج اکبر نصیب ہوا۔ ہمارے گروپ میں پنجاب یونیورسٹی کے شماریات ڈیپارٹمنٹ کے سابق پروفیسر انور، واپڈا کے ایک ایس ای عبدالحمید صاحب، اپنے گولڈن کارپٹس والے جی ڈی ضیاء اور میو ہسپتال کے پروفیسر جاوید صادق بھی تھے حج اکبر کی وجہ سے عازمینِ حج کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ شاید سعودی حکام اس کی سرکاری گنتی بھی نہ کر پائے ہوں۔ کیونکہ حج اکبر کی سعادت کے حصول کے لیے سعودی عرب میں مقیم تقریباً تمام غیر ملکی مسلمان بھی مکّہ کی جانب رواں دواں تھے۔ زندگی میں اتنا ہجوم پہلے کبھی نہ دیکھا تھا

جب ہماری بس مکّہ کے ایک بازار میں ایک جگہ پر رو کی گئی تو جی ڈی ضیاء صاحب کا کہنا تھا کہ طواف تو ممکن ہے مگر سعی کرنا اتنے ہجوم میں کمزور اور ناتواں عازمین کے لیے ممکن نہ ہو گا۔ میں چونکہ خود کو توانا اور صحت مند سمجھتا تھا اور پروفیسر انور بھی چھ فٹ قد اور توانا ڈیل ڈول رکھتے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ اکٹھے ہی سعی کریں گے اور یوں بڑے بلند حوصلوں کے ساتھ ہم حرم کعبہ میں داخل ہوئے۔ یوں تو طواف کرنا بھی اپنی جگہ جان جوکھوں کا کام تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم اِس سعادت سے بہرہ ور ہو گئے۔ اب مرحلہ سعی کا تھا اور حرمِ امام رضاؑ کا

ہجوم دیکھ کر مجھے سعی ہی کے دوران ہونے والا واقعہ یاد آیا۔

ہم نے صفا کے مقام سے اپنا سفر شروع کرنا تھا۔ اب چونکہ صفا اور مروا کے درمیانی راستے کو چھت دی جا چکی ہے اور دو طرفہ راستہ بھی بنا دیا گیا ہے مگر ہم دونوں کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ کہ ہم جو خُود کو تندرست و توانا سمجھتے ہیں۔ اِس سعادت کو آسانی سے حاصل نہیں کر سکیں گے۔

ابھی ہم ابتدائی دُعاؤں ہی کے چکر میں تھے کہ ہجوم کا ایک ریلا آیا اور تو کہاں اور میں کہاں کے مصداق پروفیسر انور لاپتہ ہوگئے۔ اَب مَیں اکیلا ہجوم میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ تھوڑا بہت چھوٹے قد کا فائدہ اُٹھانے کی بھی کوشش کی مگر ہجوم کا ریلا سمندر کی خوفناک لہر کی طرح تھا۔ جس میں سے بچ نکلنا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ میں نے فوری طور پر سعی کا خیال چھوڑ دیا۔ اور اَب اس ہجوم سے باہر نکلنے کی سعی کرنے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں ایک آواز آئی۔ " یا امیرؑ المدد " میں فوراً سمجھ گیا کہ میری طرح کوئی اور شیعہ برادر افریقی عازمینِ حج کے جنگل میں پھنسا ہے اور امیر علیہ السّلام کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ میں نے جواباً آواز دی ، " یا علی مدد " ہجوم میں سے اس کا ایک ہاتھ بلند ہوا جسے مَیں نے مضبُوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور یوں ہم دونوں مولودِ کعبہؑ کا نام لیتے ہوئے اس سے قبل کہ مُشکل کشا کی جائے پیدائش پر ہی جان دے دیتے ، لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے زمزم تک آگئے۔ وہ بھی میری ہی طرح کا ایک "نوجوان" تھا۔ اُدھر زمزم کی حالت بھی قابلِ دید تھی۔ یار لوگوں نے وہاں کھڑا رہنے کا حوصلہ بھی نہ چھوڑا تھا۔ ہم دونوں حرم کے برآمدے کی طرف بھاگے اور بمشکل تمام زمزم کی ایک سبیل سے دو دو گھونٹ زمزم پی کر پندرہ منٹ کے بعد ہوش میں آئے۔ اُس نوجوان نے مجھے گلے سے لگا لیا تھا۔ حرمِ کعبہ میں دو مولائیوں کے اس ملاپ کا لُطف مجھے آج بھی یاد ہے۔

ہجوم کی صُورت یہاں بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ لوگ امامؑ کے روضے کی جالی کو ہاتھ لگانے کے لیے بے تاب دکھائی دیتے تھے ، زائرین کا ایک ہجوم تھا ، ایک جانب خواتین کے لیے

مخصوص برآمدہ تھا۔ چاروں طرف لوگ قرآن کی تلاوت، دُعاؤں اور نوافل میں مشغول تھے۔ ایک جلال تھا جو روضۂ امامؑ پر طاری تھا۔ اتنے بڑے ہجوم کے باوجود سکون کی ایک کیفیّت تھی،

یہ اس امامؑ کا روضہ ہے جسے عباسیوں نے زہر کے جام سے شہید کیا تھا اور اس امامؑ کا بھی وہی تھا۔ ملوکیت کی نفی، ظلم کی تردید، رسولؐ کی شریعت کی تبلیغ اور وقت کے جابر حکمرانوں سے عدم التفات اور یہی وہ سلسلہ ہے جو تب سے اب تک چلا آرہا ہے۔ حق والوں کو ماننے والوں نے کبھی جابر حکمرانوں کے سامنے سر نہیں جھکایا، پھانسی چڑھ گئے، سر کٹوا دیئے، زندگی کی آسائشوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، مگر جبر سے مصالحت نہیں کی۔

علی بابا نے بتایا کہ روضۂ امامؑ کے احاطہ میں خلیفہ ہارون رشید کا مزار بھی ہے مگر وہاں کوئی شخص تعزیّت کے لیے نہیں جاتا۔ مَیں نے بغور جائزہ لیا واقعتاً خلیفہ موصوف کے مزار پر کوئی فاتحہ خوانی نہیں کر رہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہی سب سے بڑا فرق فقیری اور ملوکیت میں ہے۔

میں روضہ کے دروازے کے ساتھ بمشکل ایک کونے میں کھڑا ہونے کی جگہ بنا سکا۔ ہاتھ دُعا کے لیے بلند تھے، آنکھیں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہی تھیں اور ناصر جہاں کے پڑھے اور سیّد آلِ رضا کے لکھے ہوئے معروف سلام کے دو مصرعے یاد آرہے تھے:

سکینہؑ بی بی تمہارے غلام حاضر ہیں
تجھے جو پیاس تو اشکوں کے جام حاضر ہیں

دُعائیں ہوتی رہیں وقت گزرتا رہا، بے چین دل کو آہستہ آہستہ قرار آرہا تھا۔ میرے اکلوتے بیٹے کے لیے میری ایک عزیزہ نے امامؑ کے روضے پر دُعا مانگی تھی۔ خدا نے امامؑ کے صدقے مجھے بیٹا عطا کیا اور زوجہ کی وہ بیماری جس کی بڑے بڑے گائنی کالوجسٹوں کو سمجھ نہ آتی تھی ٹھیک ہوگئی۔ چھ برس بعد خدا نے میری بیٹی کو بھائی دے دیا۔ کچھ آنسو اظہارِ تشکر کے بھی تھے۔ جس امامؑ کے نام کے ضامنی مَیں نے آج بھی اپنے بازو پر باندھ رکھی تھی۔ میں آج

اُسی امامؑ کے حضور اپنی حاجات طلب کر رہا تھا۔ یہ بھی کیا سعادت تھی۔ اِرد گرد کھڑے، بیٹھے اور چلتے پھرتے زائرین ہجوم سے بچتے۔ بچاتے دُعائیں پڑھنے میں مصروف تھے، آج سب امامؑ کے لیے آنسوؤں کا تحفہ لائے تھے اور اس حقیقت کا علم مجھے بعد میں ہوا کہ محرم کا چاند ہو گیا تھا۔ آج پہلی محرم تھی اور اہلِ مشہد اپنے امامؑ کو اس کی جد کا پُرسہ دینے آ رہے تھے۔ یہ منظر دیکھنا بھی میرے نصیب میں تھا۔ ہجوم میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ علی بابا نے مجھے بتایا کہ آج بڑے صحن میں پہلی مجلس عزا بھی بپا ہو گی جس کا اعلان باہر ہو رہا ہے۔ دعا و سلام سے فارغ ہوئے تو روضہ کی جالی کو مَس کرنے کا مرحلہ تھا۔ کچھ مدد علی بابا نے کی۔ کچھ مقامی زائرین نے میرے غیر ملکی ہونے کا لحاظ کیا اور یوں میں اپنے امامؑ کی قدم بوسی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دل پر سے جیسے کوئی بھاری پتھر ہٹ گیا تھا، جسم بالکل ہلکا پھُلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اور اب عقیدت کے ساتھ ساتھ مسرّت کا ایک عنصر بھی شامل تھا کہ امامؑ کے روضے کی زیارت کر لی تھی۔ روضہ کے تمام دروازے سونے کے نقش و نگار سے بنے ہیں، دروازوں کی طویل قامت چوکھٹیں بھی سونے کی ہیں، فانوس اس قدر قیمتی ہیں کہ بیان سے باہر اور چھتوں پر نظر ٹھہرانا بے حد مشکل کام ہے شیشہ کاری کا ایسا حسین اور ماہرانہ مظاہرہ میں نے زندگی میں نہیں دیکھا جس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ دیواروں پر بھی نقش کاری، روشنیوں کا ایک سمندر ہے جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں تصویر کشی کی سختی کے ساتھ ممانعت ہے ورنہ آپ کو چند مناظر دکھا ہی دیتا۔ ایک خادم فانوس جلانے میں مصروف تھا اور روضۂ امامؑ کے ساتھ والے برآمدے میں مجلسِ عزا کے لیے زائرین بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ باآواز بلند درود و سلام بھی جاری تھا اور دُعائیں بھی تسلسل کے ساتھ ہو رہی تھیں۔ روضہ کے دروازے پر خادموں کے دفاتر تھے جہاں نذرانہ وصول کیا جاتا ہے۔ نذرانے کی باقاعدہ رسیدیں جاری کی جاتی ہیں۔ یہ رسیدیں مختلف رقوم کی ہیں جو پہلے ہی سے شائع شدہ ہیں۔ امامؑ کے روضے کی تعمیر کا زیادہ کام

صفوی دَور میں ہوا۔ سابق رضا شاہ بھی خود کو امامؑ کے خادموں میں شمار کرتا تھا اور روضے کی تزئین و آرائش کا کام سابق شاہ کے دَور ہی میں مکمل ہوا۔

خُدا کی قدرت دیکھیے خود کو امامؑ کا خادم کہنے والا خُود امامؑ کے کردار اور اقوال سے کتنا دُور تھا اور بالآخر اس نے اس نافرمانی کی کیسی سزا پائی۔ حرم سے باہر نکلے تو رات ہو چلی تھی، فضا اور ماحول پہ ایک عجیب قسم کی اُداسی چھائی ہوئی تھی جس کا احساس بخوبی ہو رہا تھا۔

علی بابا کی بیگم اور بچّے ہمارے منتظر تھے، اب پروگرام یہ بنا کہ کھانا کھایا جائے اور پھر رات گئے۔ روضہ کا ایک اور چکر لگایا جائے۔ سڑکوں پر اسی طرح رونق تھی۔ علی بابا کا خیال تھا کہ ہوٹل جا کر پہلے کھانا کھایا جائے۔ مَیں بھی تھوڑی بہت ونڈو شاپنگ کرنا چاہتا تھا۔ علی بابا کے بچّے راستے میں عام بچّوں کی طرح ضد کر رہے تھے، کبھی کسی ٹی شرٹ کے لیے، کبھی سویٹر کے لیے، کبھی جُوتوں کے لیے اور علی بابا ان کی تمام ضدیں پوری کرنا اپنا فرض سمجھ رہے تھے۔ بچّے تو آخر بچّے ہی ہوتے ہیں۔ میں بھی مختلف چیزوں کے نرخ پوچھتا آ رہا تھا، زعفران، فیروزے، سجدے گاہ، تسبیحیں، میوہ جات، یاقوت، عقیق وغیرہ۔ خیال یہ تھا کہ شاپنگ اگلے روز کی جائے۔ ایک مقام پر مَیں، علی بابا اور اُن کا ایک بیٹا کافی آگے نکل گئے جب کہ اُن کی بیگم اور دو بیٹے پیچھے کسی دُکان پر خریداری میں مصروف تھے۔ ہم تقریباً ۲۰ منٹ شاہراہِ امامؑ کے آخری سرے پر کھڑے رہے مگر علی بابا کا آدھا خاندان غائب تھا، علی بابا کی فکر مندی فطری تھی۔ اُنھوں نے مجھ سے چند لمحے انتظار کی درخواست کی اور خود بچّوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب میرے لیے انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے خربوزہ کا رس پیا، میوے چباتا رہا مگر انتظار ایک گھنٹے سے بھی طویل ہو گیا تھا۔ اب میری فکر مندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بالآخر جب اُن کے آنے کی کوئی اُمید نظر نہ آئی اور دُکانیں بھی آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں تو میں نے واپس ہوٹل جانے کا فیصلہ کیا۔ چوک میں پہنچا تو ایک کونے میں "اوجھری" کی خوشبو آئی۔ "اوجھری" میری خاص پسندیدہ ڈِش ہے۔ فٹ پاتھ کے ساتھ

والی دیوار کے سہارے ایک پھٹا لگائے، پتیلا رکھے ایک صاحب اوجھری بیچ رہے تھے اور اُن کے گرد کئی خواتین اور حضرات اس ڈش سے محظوظ ہو رہے تھے۔ میں نے بھی سارے پرہیز بالائے طاق رکھے اور اوجھری کے شوق میں وہاں جا پہنچا مگر پیشِ نظر منظر نے میرا سارا شوق کافور کردیا۔ وہ اوجھری کا سالن نہیں ہوتا بلکہ اوجھری کا سُوپ فروخت ہو رہا تھا۔

اپنے ہاں کے ماجھے یا فیقے دال اور کڑھی والے کی طرح وہ صاحب پتیلے میں سے اوجھری کے سُوپ کا پیالہ بھرتے اس میں نمک مرچ وغیرہ شامل کرتے۔ پتیلے کے ڈھکن پر رکھی اوجھری میں سے دو تین بوٹیاں قینچی سے کاٹ کر پیالے میں ڈالتے اور گاہک کے حوالے کر دیتے جسے "شائقین" بڑے مزے سے روٹی ڈبو کر کھا رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر بدن میں جھرجھری سی آگئی۔ ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ایک دُکان کے آگے گاہک قطار میں کھڑے تھے۔ معلوم ہوا یہاں مرغ روسٹ ملتا ہے اور اس کی مقبولیت کا اندازہ گاہکوں کی تعداد سے بخوبی ہو رہا تھا۔ روسٹ ہوتے ہوئے مُرغ کی خوشبو بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے جدّہ میں ہندوؤں کی ایک بروسٹ شاپ بہت یاد آئی جہاں سے ٹوکن حاصل کرنے کے بعد بروسٹ ملتا تھا، یہ سب دیکھ کر احساس ہوا کہ عربوں اور عجمیوں میں خوراک کی عادت کے سلسلے میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جی بہت چاہ رہا تھا کہ آج مُرغ روسٹ سے شغل کیا جائے مگر گاہکوں کی اتنی بڑی قطار دیکھ کر حوصلہ نہ ہوا۔ دھیان تو علی بابا اینڈ کمپنی کی طرف لگا تھا۔ ہوٹل کے قریب ہی ایک دُکان پر کچھ اچھے جوتے اور پینٹنگز دکھائی دیں۔ اس دُکان پر دو بزرگ بیٹھے تھے۔ کچھ چیزیں پسند کیں بھاؤ تاؤ کیا اور بنڈل بنا کر ساتھ لے لیا۔ ہوٹل پہنچا، سامان لابی میں رکھا، بھوک اب زوروں پر تھی، ریسٹورانٹ میں پہنچا تو علی بابا اینڈ کمپنی کھانے میں مصروف تھی، اِن کھوئے ہوؤں کو پا کر خوشی بھی ہوئی اور غصّہ بھی آیا کہ مجھے وہاں انتظار میں چھوڑ کر خود مزے سے کھانے میں لگے ہیں مگر جب علی بابا نے بتایا کہ خود اس کے ساتھ بھی یہی واقعہ ہو چکا ہے کہ وہ بچّوں کی تلاش سے تھک کر ابھی ابھی ہوٹل پہنچا تو

بیگم صاحب معہ بچوں کے یہاں تشریف فرما تھیں اور کھانے کا آرڈر دیا ہوا تھا۔ اب اُن کا اصرار تھا کہ مہمان نوازی کا " شرف " اُنہیں بخشا جائے، بحث کا چارا نہیں تھا اس لیے اُن کے ساتھ کھانے میں شریک ہوگیا۔ اس کے بعد حسبِ معمول کافی کا گرم گرم کپ پیا۔ ۲۴ گھنٹے کی مسلسل سفری کیفیت، بھاگ دوڑ تھکان اور شام کو کھائی جانے والی گولی کا اثر، طے یہ پایا کہ ابھی میرے کمرے میں محفل جمے گی، گپ شپ کریں گے۔ دراصل علی بابا کے بچے اس اثنا میں میرے ساتھ خاصے مانوس ہو چکے تھے۔ اُن کا اصرار تھا کہ میرے کمرے میں کچھ وقت گزارا جائے۔ کھانے کے بعد میرے نیک دل میزبان میرے کمرے میں آگئے، کمرے کی خنک فضا اور کمبل کی گرمی نے گولی کا اثر کچھ اور بڑھا دیا تھا، آنکھیں مُندی رہی تھیں۔

علی بابا نے کچھ فروٹ وغیرہ منگوایا، ایک بار پھر باتیں شروع ہوگئیں۔ میں نے اب اپنا تفصیلی تعارف کروایا تھا۔ اب ہماری گفتگو کا موضوع سیاسیاتِ عالم سے زیادہ دوستانہ تھا۔

مَیں نے علی بابا کو اپنا فیملی پورٹریٹ دکھایا جسے میں سفر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں وہ میرے بچوں کی تصاویر دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ مَیں ایک بار پھر ایران آؤں اور تہران میں اُن کا مہمان بنوں، وہ صبح سے اب تک یہ دعوت کئی بار دے چکے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اُن کی اِس دعوت میں خلوص کی پاکیزگی کا عنصر نمایاں ہے۔ اُن کی یہ دعوت آج بھی میرے ذہن میں ہے اور اب کبھی ایران جانا ہوا تو مَیں یقینی طور پر سرکاری مہمان بننے کے بجائے علی بابا کا مہمان بننا پسند کروں گا۔ باتیں ہوتی رہیں اور جب علی بابا نے محسوس کیا کہ اب میں زبردستی گفتگو کر رہا ہوں۔ انہوں نے اجازت چاہی، اُن کے بچے حسبِ عادت میرے کیمرے وغیرہ سے کھیلتے رہے۔ میں نے دو فلمیں خرید لی تھیں اور میرا پروگرام اگلے روز فوٹوگرافی کرنے کا تھا۔ علی بابا کے جاتے ہی اس کے باوجود کہ دل یہ چاہتا تھا کہ ایک بار پھر روضے کو چلا جائے۔ نیند ایسی غالب آئی کہ اس رات میں نے یقینی طور پر خلافِ معمول زوردار خراٹے لیے ہوں گے

صبح خاصی خوشگوار تھی، میری آنکھ ۹ بجے کے قریب کھلی، میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور ناشتے کے لیے بھاگم بھاگ ریسٹورانٹ میں پہنچا کیونکہ وہاں ایک بورڈ بڑا واضح دکھائی دیا تھا کہ ۱۰ بجے کے بعد ناشتہ نہیں ملے گا۔ ریسٹورانٹ میں موجود واحد ویٹر نے میرا بڑی خوشدلی سے استقبال کیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھے کمرے کے مل جانے پر خوش تھا۔ اس وقت ریسٹورانٹ خواتین اور بچوّں سے بھرا ہوا تھا غالباً بچوّں کے لیے خصوصی نشریات آ رہی تھیں۔ بچّے خاصے خوش دکھائی دیتے تھے۔ یہاں میری ملاقات دو نوجوانوں سے ہوئی۔ یہ دونوں نوجوان شیراز سے آئے تھے اور اُن کی حرکات و سکنات سے محسوس ہوتا تھا کہ کھاتے پیتے گھرانوں سے ان کا تعلق ہے۔ پہلے پہل تو وہ بھی مجھے حیرت سے دیکھ کر مسکراتے رہے اور پھر جب میں نے کچھ اُن کی حوصلہ افزائی کی تو چائے کے پیالے ہاتھ میں لیے میرے ساتھ آن بیٹھے۔ وہ دونوں نوجوان شروع میں بڑی محتاط گفتگو کرتے رہے مگر میری جانب سے گرین سگنل پاتے ہی اُنھوں نے کھُلم کھُلا گفتگو شروع کر دی۔ وہ مذہب سے بیزار دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے خیال میں زندگی کا لُطف بریک ڈانس، کلب، کیسینو اور پینے پلانے میں ہے' وہ یورپی طرزِ زندگی سے خاصے متاثر تھے۔ مجھے اُن کی باتیں سُن کر خاصا مزہ آ رہا تھا، میں نے ایک سے کہا کہ تمہیں روکا کس نے ہے جاؤ سڑک پر جا کر بریک ڈانس کرو۔ اگر زندگی کا لطف اس میں ہے تو کیوں نہیں اُٹھاتے یہ لطف مگر اُس نے جواب میں گردن پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا کہ ابھی اس کا قتل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ دونوں طالب علم تھے اور سیر و تفریح کی غرض سے گھر سے نکلے تھے، ابھی اُن کا ارادہ اصفہان جانے کا بھی تھا، میرے پورے قیام ایران کے دوران یہ پہلے نوجوان تھے جن کے خیالات عام نوجوانوں سے مختلف تھے۔ یعنی اسے آپ ایرانی نوجوانوں کی پہلی اپوزیشن قرار دے سکتے ہیں۔ میں واضح طور پر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اُن کے خیالات کے اظہار میں کہیں خوف کی جھلک بھی موجود تھی۔ ایک نوجوان تو خاص طور پر مذہب سے بالکل بے بہرہ اور برسرِ پیکار دکھائی دیتا تھا۔ اُسے مَیں نے مسٹر شیطان کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ دونوں

ویٹر کے ساتھ بھی ہنسی مذاق کر رہے تھے اور مجھے اُن سے مل کر اپنے ہاں کی بے مہار یُوتھ یاد آرہی تھی جو آج بھی الحمرا آرٹ سنٹر کی سیڑھیوں پر ہال میں ہونے والے بریک ڈانس کنسرٹ کا ٹکٹ ہزار روپے کے عوض خریدنے پر بھی آمادہ ہوتی ہے اور نشستیں پُوری ہونے کے باوجود ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر پرفارم کرنے والوں کے ساتھ تھرکتی دکھائی دیتی ہے۔

مَیں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ یورپی کلچر کی جڑیں بہرحال بے حد مضبوط ہیں۔ یُورپی کلچر کی مادر پدر آزادی واقعتاً ترقی پذیر ممالک کی آزاد نوجوان نسل کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ اس کا ایک کرشمہ مَیں آج ان نوجوانوں سے گفتگو کے دوران دیکھ رہا تھا۔ جن کے سامنے شہیدوں کی لاشیں آرہی تھیں، بڑی طاقتوں کے ساتھ ایک فیصلہ کُن جنگ لڑی جا رہی تھی مگر وہ ان تمام باتوں کے باوجود بریک ڈانس کو زندگی کا حق قرار دے رہے تھے۔ ان نوجوانوں کے بھی عجیب و غریب مسائل ہوئے ہیں۔ مَیں نے سوچا ان نوجوانوں نے یقیناً تلخیٔ ایام کا مزہ نہیں چکھا۔

مذہب سے بے گانہ نوجوان سگریٹ بھی تواتر کے ساتھ پی رہا تھا، اس نے مجھ سے تصاویر بنانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا جسے میں نے قبول کر لیا، ویٹر یہ سب منظر غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بھی ایک تصویر بنائی۔ ٹی وی پر بچّوں کا پروگرام ختم ہو چکا تھا اور اب وہاں عورتوں کو سویٹر کی بُنائی کے مختلف طریقے بتائے جا رہے تھے۔ ہوٹل کی لابی میں کاؤنٹر کے عین اُوپر ایک بہت بڑی پینٹنگ نصب تھی جسے میورل کہنا بہتر ہو گا۔ اس میں پریاں، جن، چرند، پرند، شاعر، ادیب، فقیر اور دیگر مخلوقات کو امام رضاؑ کے روضے کی جانب جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ میں ان نوجوانوں سے گفتگو کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں علی بابا اینڈ فیملی بھی نیچے آگئی۔ علی بابا نے بتایا کہ میرے کمرے میں صبح سے فون کر رہے ہیں مگر شاید میری نیند اتنی گہری تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بھی مجھے بیدار نہ کر سکی۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ شہر کے معروف باغ کی سیر کو جا رہے ہیں مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے شام کی فلائٹ سے واپس تہران جانا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ زیادہ وقت امامؑ کے روضے پر گزاروں۔

میری بات اُن کی سمجھ میں آگئی تھی۔ بہرحال انہوں نے ۲ بجے تک واپس آجانے کا کہا اور بچّوں کو لے کر چلے گئے۔ میں نے کیمرہ کندھے پر ڈالا۔ کچھ کرنسی جیب میں رکھی اور پھر روضے کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں کچھ شاپنگ کا پروگرام بھی تھا، مجھے خاص طور پر شیخ اُمید علی کے یاقوت کی فکر تھی۔ بالآخر ایک دُکان سے یاقوت مل گیا اور میں نے حالتِ جیب کی پروا کیے بغیر وہ یاقوت خرید لیا۔

شاہراہِ امامؑ پر پہنچا تو سڑک پر باوردی نوجوانوں کی ایک قطار دکھائی دی، اُن کے دو تین لیڈر ہاتھ میں علم پکڑے اُن کی قیادت کر رہے تھے، لوگوں کا ایک ہجوم ان نوعمروں کو دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ دستہ لڑنے کے لیے محاذِ جنگ پر جا رہا ہے اور روانگی سے قبل یہ لوگ امامؑ کے مزار پر سلام کرنے جا رہے ہیں۔ تیرہ چودہ برس کی عمروں کے یہ نوجوان خاکی وردیوں میں ملبوس تھے، ان کے ماتھوں پر سُرخ رنگ کی پٹیاں بندھی تھیں جن پر "راہیانِ کربلا" "اللہ اکبر، خمینی راہبر" اور "پاسدارانِ انقلاب اسلام" کے الفاظ نمایاں تھے۔ بعض نوجوانوں نے سروں پر کفن نما کپڑا باندھ رکھا تھا، یہ منظر بجائے خود دیدنی اور رقعت آمیز تھا، مَیں تصویریں بنا رہا تھا اور جذبات کی شدّت سے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے، نوجوانوں کا یہ دستہ آہستہ آہستہ امامؑ کے روضے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مَیں ان جانثاروں کو چھوڑ کر سیدھا امامؑ کے روضے پر پہنچا، شیخ اُمید علی کے لیے خریدے گئے یاقوت اور اپنے ہاتھ کے فیروزے اور انگوٹھی کو جالی سے مَس کیا، روضے کے ماحول کی ٹھنڈک کا لطف لینے لگا، عقیدت کے کئی مناظر میرے پیشِ نظر تھے، درُود و سلام کا سلسلہ جاری تھا، کیف کا عالم طاری تھا کہ اچانک مجھے ماتم کی آوازیں آنے لگیں، میں نے امامؑ سے رُخصت لی اور سینکڑوں التجائیں اور لاکھوں حاجات کے پورا ہونے کی استدعائیں کرتا میں صحنِ حرمِ امامؑ میں آیا۔ یہاں جانثاروں کا وہی دستہ تھا جو قطار اندر قطار بیٹھا تھا، اُن کا گروپ لیڈر مرثیہ پڑھ رہا تھا، ان معصوم چہروں والے جوانمردوں اور بلند حوصلہ نوجوانوں کے گرد بڑے بڑے علماء اور بزرگوں، عورتوں اور بچّوں کا

گھیرا تھا، جن کے ہاتھ سینوں پر اور آنکھوں میں برسات کی جھڑی تھی۔ مرثیہ کے ساتھ ساتھ ماتم بھی ہو رہا تھا، گروپ لیڈر گریہ کرتے ہوئے آواز بلند کرتا۔

واویلا ، واویلا ، واویلا

ہلالِ محرم شُد ہویدا

عزائے حُسینؑ شُد برپا

اور جواب میں سب لوگ سینوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہتے :

واویلا ، واویلا ، واویلا

یہ منظر بجائے خُود دیدنی تھا، وہ کونسی آنکھ تھی جو پُرنم نہ تھی، وہ کونسا سینہ تھا جس پر ہاتھ نہیں پڑ رہا تھا۔ سر پر دھوپ چمک رہی تھی، گریہ و زاری کا منظر جاری تھا کہ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "جیتے رہو، ملّت کے نگہبانوں" امامؑ تمہارے مددگار ہوں" خدا تمہارے حوصلوں کو یونہی برقرار رکھے" آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور مجھے اُن دونوں نوجوانوں کے نصیب پر افسوس ہو رہا تھا جو ہوٹل کے ریسٹورانٹ میں بیٹھے بریک ڈانس کو زندگی کا حُسن قرار دے رہے تھے، کیا زندگی کا اس سے بھی حسین کوئی اور رُخ ہو سکتا ہے۔

مرثیہ، گریہ و ماتم کے بعد دُعا کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُس نوجوان لیڈر کے لفظوں میں کیا تاثیر تھی کہ آنکھوں کے سوتے خشک نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے دُعائیہ کلمات کے جواب میں آمین کی بلند آواز ایک نیا صوتی منظر پیدا کر رہی تھی۔ میں انہی دُعاؤں کی بازگشت کو ساتھ لیے حرمِ امامؑ سے رُخصت ہوا، دل مودّت اہلِ بیت سے منوّر تھا، سینہ روشن ہو چکا تھا۔ آنکھیں توانا ہو گئی تھیں، اعصاب پہلے سے کہیں زیادہ قوی تھے۔ عقیدتوں اور جذبوں کے یہ منظر دل و نگاہ میں گھر کر چکے تھے، زندگی نے ایک نیا رُخ متعین کر لیا تھا، جس میں جذبوں کی شدّت اور جذبات کا ٹھہراؤ تھا۔

مَیں نے اپنی ذات کے متعلق، اپنے رویّوں کی نسبت کئی ایک اہم فیصلے کیے تھے اور

خدا کا شکر ہے کہ مَیں تا دمِ تحریر ان فیصلوں پر قائم ہوں ۔ ۲/۱ ۴ بجے فلائٹ تھی۔

ہوٹل واپس پہنچتے پہنچتے، سوا تین بج چکے تھے۔ اس لیے فوری طور پر سامان سمیٹا، کپڑے تبدیل کیے اور لابی میں آگیا۔ علی بابا میرے منتظر تھے، اُن کے بچّے میری واپسی پر آزردہ دکھائی دیتے تھے، مَیں نے اُن کے ماتھے چُومے، علی بابا نے کئی بار معانقہ کیا اور یُوں ایک اچھا دوست مشہد میں چھوڑ کر مَیں ٹیکسی میں سوار ہو رہا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی میری نگاہ ہوٹل کے سامنے واقع پٹرول پمپ پر کھڑے موٹر سائیکلوں کے ایک دستے پر پڑی ان سب نوجوانوں نے موٹر سائیکلوں کے ہینڈلوں پر پھُول سجا رکھے تھے جن کے درمیان مختلف نوجوانوں کی تصاویر تھیں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے یہ سب ماجرا دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج مشہد کے چند شہداء کی لاشیں آ رہی ہیں، یہ سب اُنہی کی تصاویر ہیں اور یہ اُن شہداء کے بھائی، رشتہ دار اور دوست احباب ہیں جو ائیر پورٹ پر شہداء کے تابوت لینے جا رہے ہیں، میری آنکھیں ایک بار پھر چھلک پڑیں اور میں ان شہیدوں اور اُن کے عزیزوں کے جذبوں کو سلام پیش کرتا ہوا ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ایران کے ہر شہر میں ہفتے کے مختلف دنوں میں شہداء کے لاشے آتے ہیں اور اُن کے عزیز انہیں اس اہتمام کے ساتھ لینے جاتے ہیں۔

ائیر پورٹ پر چیکنگ بے حد سخت تھی، سارا سامان کھلوا کر دیکھا گیا۔ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جا رہی تھی، ایک ایرانی اس بات پر بضد تھا کہ دُودھ کے ڈبوں کو نہ کھولا جائے مگر سکیورٹی سٹاف کا کہنا تھا کہ وہ ان میں سُوا مار کر ضرور دیکھیں گے، کسی بھی قسم کی رعایت دینا اُن کے بس میں نہیں ہے اور اس ایرانی مسافر کے احتجاج کے باوجود سکیورٹی والوں نے اپنا کام دکھا دیا اور وہ مسافر اس بات پر پریشان تھا۔ کہ ڈبوں میں سُوراخ ہو جانے کی وجہ سے اَب یہ دُودھ استعمال کے قابل نہیں رہے گا۔

مَیں نے بورڈنگ کارڈ حاصل کیا اور ائیر پورٹ پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ بیسمنٹ میں

ایک مارکیٹ بھی تھی جہاں ملبوسات، کھلونوں، دستکاریوں اور میوہ جات وغیرہ کی دُکانیں تھیں۔ مسافروں کی گیلری میں مشروبات کا کاؤنٹر بھی تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر چائے پی۔ اسی اثنائیں جہاز کی روانگی کا اعلان ہوگیا اور میں دیگر مسافروں کے ساتھ قطار میں مَیں کھڑا ہوگیا۔ میرے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور کندھے پر کیمرہ بھی تھا، لاؤنج میں داخلے سے پہلے ایک بار سخت سکیورٹی چیکنگ ہو رہی تھی، ڈیوٹی پر موجود نوجوان نے مجھ سے مختلف سوالات پُوچھے میں نے اُسے کانفرنس کا نشان دکھایا، وہ میری باتوں سے خاصا مطمئن تھا مگر کیمرے کے بارے میں وہ ابھی تک مطمئن نہیں تھا، اس نے پُوچھا کہ لوڈڈ ہے میں نے کہا ہاں، کہنے لگا آپ کی تصویر بنا دوں، مَیں نے کہا ضرور بناؤ اور پھر جب تک اس نے میری تصویر بنا کر اپنی تسلی نہیں کر لی، اُسے چین نہیں آیا، لاؤنج میں بیٹھے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سب مسافروں کی نظریں رَن وے پر لگ گئیں۔ دو شہداء کے لاشے اُتارے جا رہے تھے، ویل چیئر پر ایک زخمی غازی بھی تھا جس کی بیوی اس کے ساتھ جہاز سے اُتر رہی تھی۔ سب کے چہروں پر پائی جانے والی افسردگی صاف دکھائی دے رہے تھے، میرا دل بھی بجھ سا گیا، زخمی سپاہی اور اس کی بیوی ہمارے ساتھ مشہد سے تہران آئے، واپسی کا سفر خاصا خاموشی سے گزرا، ہوٹل پہنچا تو ویرانی سی محسوس ہوئی۔ بیشتر مندوب واپس جا چکے تھے، ڈاکٹر حسنات، کرنل ڈاکٹر فیصل اور راجندر سرین ہی موجود تھے، دو روز بعد ہماری کراچی کی فلائٹ تھی، افضل حیدر اور ان کی بیٹیاں شیراز جا چکے تھے اور ابھی اُن کا ایران میں رُکنے کا پروگرام تھا۔

راجندر سرین بھی تہران میں رُکنے کا ارادہ رکھتے تھے، میرا مقدس سفر ابھی ادھورا تھا۔ امامؑ کے روضے کی زیارت کے بعد اب امامؑ کی ہمشیرہ معصومہ قم کے روضے کی زیارت باقی تھی اور میں اگلے روز اس زیارت سے بھی مشرف ہونے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر اپنے واپسی کے پروگرام کے بارے میں پاکستان ٹیلیکس بھیجا۔ حسبِ معمول کھانا اور پھر کافی پی، کرنل صاحب رات گئے تک مجھ سے مشہد کے بارے میں سوالات کرتے رہے وہ بار بار کہتے بہت جی چاہ رہا تھا۔

مگر اَب کیا کریں وقت ہی بہت کم ہے۔ ایک رات اور ایک دن باقی تھا اور مَیں مطمئن تھا کہ ہر کام احسن طریقے سے انجام پا گیا ہے۔

جنگ بندی کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ ۲۰ اگست کو ۳ بجے رات عراق اور ایران دونوں کی جانب سے فائر بندی کی جانے والی تھی، اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل پیرز ڈی کوئیار نے اس شیڈول کا اعلان کرتے ہوئے اُمید ظاہر کی تھی کہ اَب خلیج میں امن ہو جائے گا اور دونوں ممالک کے وفود اپنے باہمی اختلافات کو مذاکرات کی میز پر حل کریں گے۔ جنگ بندی کو فعال بنانے کے لیے اقوامِ متحدہ کی امن فوج کی تعیناتی کا پروگرام بھی ترتیب پا چکا تھا۔ میرے ایران کے قیام کا آخری مرحلہ قُم کی زیارات تھا۔ قُم کی دینی درسگاہ حوزہ علمیہ قُم کے جیّد علمائے سے میری تہران ہی میں کانفرنس کے دوران ملاقات ہو چکی تھی جس کا احوال میں گزشتہ صفحات پر درج کر چکا ہوں، میرا خیال تھا کہ الصبح روانہ ہو کر شام سے پہلے واپس تہران پہنچا جائے تاکہ شام میں کچھ تھوڑی بہت شاپنگ بھی کی جائے۔ مگر ہوٹل سے بس ٹرمینل تک ٹیکسی اور پھر بس کا انتظار، اوقاتِ روانگی کے بارے میں بھی معلومات نہ تھیں۔ ہوٹل کی لابی کے کاؤنٹر پر معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ تہران سے باہر جانے والی بسوں کے اڈے جنوبی اور شمالی تہران میں واقع ہیں اور یہ بسیں نہ تو تہران شہر میں داخل ہو سکتی ہیں اور لوکل بس اور ٹیکسی کے علاوہ بھی دوسرا کوئی ذریعہ نہیں کہ مطلوبہ بس ٹرمینل تک پہنچا جا سکے، سب سے اہم مسئلہ وقت کا تھا چنانچہ ٹیکسی والوں سے احوال پوچھا تو معاملہ خاصا پریشان کُن تھا۔ ہوٹل کی ٹیکسی سروس ۴۰ ہزار ریال یعنی ۴ ہزار تومان سے کم میں جانے پر راضی نہ تھی۔ مجھے بے حد افسوس ہوا کہ رات ائیرپورٹ سے ہوٹل آتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور سے میں نے قُم جانے کے لیے کہا تھا وہ صبح نو بجے ہوٹل پہنچنے پر راضی تھا اور اس نے ۱۵ سو تومان طلب کیے تھے۔ اُس وقت یہ کرایہ مجھے بہت لگا تھا اور میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کر دی تھی مگر اَب جو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا تو اپنے اس فیصلے پر افسوس ہوا۔ بہرحال یہ سوچ کر کر زیارت کے لیے جا رہا ہوں۔ زیادہ بھاؤ تاؤ

نہ کہ پایا کیونکہ وقت پر واپس آنے کی ایک ہی صورت تھی۔ خاصی بحث کے بعد بالآخر ۳۰ ہزار ریال یعنی ۳ ہزار تومان پر بات طے ہوگئی۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو ہمیں پہلے روز تہران شہر لے گیا تھا۔ وہ اس کرائے میں اپنی انگریزی دانی کا معاوضہ بھی شمار کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک تو میری گاڑی بڑی ہے۔ دوسرے میں انگریزی بولتا اور سمجھتا ہوں آپ کو سارا راستہ خاموش بیٹھنا نہیں پڑے گا۔ گپ شپ میں راستہ گزر جائے گا۔

میں اس کی ان تمام دلیلوں کے آگے بے بس تھا۔ چنانچہ یا علیؑ کا نعرہ لگایا اور ہم قُم کی طرف روانہ ہوگئے۔ صبح کا وقت تھا لوگ کام کاج پر جا رہے تھے، سڑکوں پر معمول سے زیادہ رش تھا۔ ڈرائیور مختلف راستوں سے گزرتا ہوا، شارٹ کٹ بناتا ہوا تہران سے باہر بڑی شاہراہ پر ہولیا۔ اس کی تمام تر برق رفتاری اور "شارٹ کٹ" کے باوجود ہمیں تہران سے قم کی شاہراہ تک پہنچنے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ مجھے آج پھر حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس سارے عرصے بس ایک یا دو مقامات کے علاوہ مجھے کہیں بھی ٹریفک کانسٹیبل دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کہیں ٹریفک کے اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہیں قطار اندر قطار پھنسی ہوئی گاڑیاں دکھائی دیں۔ ایران میں ہر جگہ مجھے سڑکوں کا نظام قابلِ رشک لگا، کشادہ اور صاف ستھری سڑکیں اور ایک سے ایک ملی ہوئی لاتعداد، شاید ٹریفک جام نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ قُم روڈ پر نکلے تو چند کلومیٹر کے فاصلے پر بہشت زہراؑ کا بورڈ دکھائی دیا۔ یہ بھی شہدا کی جنت ہے اور غالباً ایران میں سب سے بڑا قبرستان یہی ہے۔ بلاشبہ ایکڑوں میں پھیلا ہوا یہ قبرستان وہی منظر پیش کر رہا تھا جو گلستانِ شہدا اصفہان میں دیکھ چکے تھے مگر یہ قبرستان گلستانِ شہدا اصفہان سے کئی سو گنا بڑا تھا، اُسی ترتیب سے بنی ہوئی شہدا کی قبریں اور اُن کے سرہانے لگے فریموں میں اُن کی تصاویر، ایک مظلومیت تھی جو تا حدِ نظر پھیلی ہوئی تھی، حسرت و یاس کا ایک عالم تھا جسے دیکھ کر آنکھیں چھلک پڑتی تھیں، صبح کا وقت تھا اس لیے نہ تو اس وقت کوئی رونے والا تھا اور نہ ہی کوئی پُرسہ دینے والا، چار جانب ایک ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی جو اپنی بے زبانی میں

لاکھوں قصّے دُہرا رہی تھی، جذبوں کی داستانیں سُنا رہی تھی۔ وطن کی آن پر مٹنے والوں کو خراجِ عقیدت پیش کر رہی تھی، میں یہ مناظر زیادہ دیر تک نہ دیکھ پایا اور ہم ان شہدائے کے حضور اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے ایک بار پھر قُم کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے میری طبیعت کی افسردگی کو بھانپ لیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا میوزک، میں نے YES کہتے ہوئے سر ہلایا اور اس نے ایرانی موسیقی کی کیسٹ لگا دی۔

شاہراہِ قُم بھی ایران کی دیگر شاہراہوں کی طرح کُشادہ اور صاف سُتھری ہے۔ جس کے دونوں جانب ٹریفک چلتی ہے، درمیان میں لوہے کا جنگلہ لگا ہوا ہے جو تہران سے قُم تک موجود ہے۔ تقریباً ہر میٹر کے فاصلے پر اس جنگلے کے اُوپر قم کے شہداء کی تصاویر لگی ہیں۔ یہ تصاویر ایرانی مصوروں نے بنائی ہیں اور یہ ایک طرح کا ان شہداء کو خراجِ عقیدت ہے جن کا تعلق اس شہر سے ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ قُم شہر تک ان تصاویر کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قُم شہر کے رہنے والوں نے بھی اپنی آزادی اور انقلاب کی پاسداری کی کتنی بڑی قیمت چُکائی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پہاڑی سلسلے ہیں۔ ان پہاڑی سلسلوں کو دیکھ کر اور اس وقت کو یاد کر کے کلیجہ مُنہ کو آنے لگا کہ امام رضاؑ کی یہ معصُومہ بہن جس کے روضے کی زیارت کو میں جا رہا تھا کس طرح ان دشوار گزار راستوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں گی۔ یہ ویرانے آج سے صدیوں پہلے کیسے ویرانے ہوں گے، یہ جنگل، یہ سنگلاخ پہاڑ یہ بیابان، ان سب باتوں کا خیال کرتے ہی دل تڑپ اُٹھتا۔ قُم کے راستے میں ایک جگہ سفید رنگ کی جھیل دکھائی دیتی ہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ سالٹ لیک یعنی نمک کی جھیل ہے اور یہاں کا نمک نہایت عُمدہ ہوتا ہے۔ "پھر تو یہاں کا پانی بھی نمکین ہو گا"۔ میں نے پُوچھا:

"جی ہاں تب ہی تو آبادی نہیں ہے آس پاس"۔ ہم تقریباً ۲ گھنٹے میں قُم شہر کی چیک پوسٹ پر پہنچ گئے۔ اپنے ہاں کے راوی پُل کی طرح یہاں ٹول ٹیکس بھی لیا جا رہا تھا۔ ایک باوردی فوجی ہماری طرف آیا، اِدھر اُدھر دو تین بسیں بھی کھڑی تھیں جن کی معمول کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ سپاہی

نے آتے ہی فارسی میں ڈرائیور سے پوچھا، ڈرائیور نے اُسے میرا کانفرنس کا نشان دکھاتے ہوئے بتایا کہ مَیں سرکاری مہمان ہوں اور چونکہ شیعہ بھی ہوں اس لیے زیارت کے لیے جا رہا ہوں، اس پر اس نوجوان فوجی نے ہمیں سلوٹ کیا اور ڈرائیور اس بات پر خوش تھا کہ ہمیں ٹول ٹیکس کی ادائیگی سے بھی مستثنےٰ قرار دے دیا گیا تھا۔ ٹیکسی ایک بار پھر خراٹے بھرنے لگی۔ چیک پوسٹ پر سختی کا معاملہ سامنے لگا بورڈ دیکھ کر میری سمجھ میں آیا یہ سڑک بندر عباس کی طرف جاتی تھی جہاں ایران کی سب سے بڑی آئل ریفائنری ہے اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں عراقی بمباروں نے خاصی "مشقت" کی ہے۔ ہماری ٹیکسی دائیں جانب مُڑ گئی۔ چند میٹر کے فاصلے پر قُم کا داخلی چوک ہے جس کے درمیان ایرانی جھنڈے کا نشان (اللہ) لٹک رہا ہے۔ مَیں نے ٹیکسی ڈرائیور سے درخواست کی کہ چند لمحے رُک جائے مَیں نے اس کی تصویر بنائی اور ہم قم شہر میں داخل ہو گئے۔

یہاں بھی تہران کی طرح گھروں، دفتروں اور دُکانوں پر سیاہ پرچم لگ چکے تھے، بیشتر لوگوں نے بھی سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ دفتروں کے باہر بڑے بڑے بینر بھی لگے تھے جن پر محرم کے حوالے سے اشعار، سلوگن اور مختلف جُملے تحریر تھے۔

ٹیکسی معصومہؑ قم کے روضے کے قریب آ کھڑی ہوئی، ہم نے وضو کیا اور روضے کے قریب بہتے ہوئے برساتی نالے کے پُل کو پار کر کے روضے کے حرم میں داخل ہو گئے۔ معصومہؑ کے روضے کا آرکیٹکچر بھی تقریباً وہی ہے جو امام رضاؑ کے روضے کا ہے۔ ویسے ہی طلائی گنبد، نقش نگاری اور چھتوں پر شیشہ کاری، لوگوں کی ایک بڑی تعداد دُعاؤں، قرآن کی تلاوت اور نوافل کی ادائیگی میں مصروف تھی۔ زیارت اور دُعاؤں سے فارغ ہو کر روضہ کے بڑے صحن میں آئے تو پیاس محسوس ہوئی، صحن میں ایک بڑا سا تالاب تھا جس کے کنارے پینے کے پانی کی ٹنکیاں رکھی ہیں۔ پانی پینے لگا تو ایک اور پاکستانی بھائی سے ملاقات ہوئی وہ اپنے بیوی بچوں سمیت زیارات کے لیے آیا تھا۔ اُس نے مجھے پہچان کر کہا "پاکستان سے آئے ہیں" مَیں نے کہا "ہاں" وہ خوشی سے مجھے گلے لگاتے ہوئے بولا میں مزنگ کا رہنے والا ہوں، روضے کے حرم میں ایک

لوہور ہیئے سے ملاقات عجیب اتفاق تھا، ہم دونوں پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے اور ڈرائیور ہماری باتیں سُن کر مُسکرا رہا تھا۔ حرم سے باہر نکلے تو وہ مجھ سے پُوچھنے لگا یہ آپ کونسی زبان بول رہے تھے۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ اِس دُنیا میں فارسی اور انگریزی ہی دو زبانیں نہیں ہیں، ہر خطے کے باسی اپنی زبان، اپنا کلچر اور اپنا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ رکھتے ہیں، روضہ کے سامنے والے بازار میں زائرین خریداری میں مصروف تھے۔ بھُوک بھی لگنے لگی تھی۔ مَیں نے ڈرائیور کو کھانے کی دعوت دی اور ہم ایک ریسٹورانٹ کی طرف چل دیئے، ریسٹورانٹ کے ساتھ والی دیوار پر اچانک میری نظر علامہ عارف الحسینی شہید کی تصویر پر پڑی، یہ ایک بڑا سا پوسٹر تھا جس میں اُن کے قتل کے بارے میں تفصیلات تھیں اور اُن کی خدمات کا اعتراف درج تھا، مجھے یہ پوسٹر دیکھ کر احساس ہوا کہ علامہ کے قتل کا ردِ عمل صرف حکومتی سطح پر ہی نہیں تھا بلکہ اسے عوامی سطح پر بھی محسوس کیا گیا تھا اور یہ پوسٹر اسی کا ایک ثبوت تھا۔

ریسٹورانٹ میں وہی گرما گرم اُبلے ہوئے چاول، سلاد، روٹی، چلّو کباب اور کولا' بھُوک ٹھیک ٹھاک لگی تھی۔ اِس لیے خُوب جی بھر کر کھانا کھایا، کھانے کے بعد حسبِ معمول چائے بھی پی گئی۔ میں نے کھانے کا بِل ادا کیا تو ڈرائیور کچھ پریشان سا لگ رہا تھا اس کا کہنا تھا کہ کھانے کا بِل اس کے کرائے میں سے ادا کیا جائے۔ مگر مَیں پُورے طور پر میزبان بننے کے چکر میں تھا اور اپنے دوست ٹیکسی ڈرائیور کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ ہم پاکستانی بھی اچھے میزبان ہوتے ہیں۔ بات ذرا حالات کی ہے، کھانا کھانے کے بعد ہم ایک بار پھر ٹیکسی میں بیٹھے اور اَب قم شہر کی سیر ہو رہی تھی، حوزہ علمیہ قُم کی عظیم الشان عمارت واقعی قابلِ دید تھی، مجھے اس بات کا ساری زندگی افسوس رہے گا کہ میں اِس عمارت کو پُوری طرح نہ دیکھ سکا، یہاں کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر تشنگانِ علم سے سیر حاصل گفتگو نہ کرسکا تاہم یہ اطمینان ضرور ہے۔ کہ کانفرنس کے دوران بعض اہم علمائے سے ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ ہم نے شہر کا ایک چکر لیا اور اس پُرسکون اور ہنستے بستے شہر کو اسی طرح ہنستے بستے رہنے کی دعائیں دیتے ہوئے ہم

واپس تہران کی طرف روانہ ہوئے، سُورج کی تمازت میں کمی کی کوئی صُورت دکھائی نہ دیتی تھی، سڑکوں کی تارکول بھی گرمی کی شدّت سے پگھل رہی تھی، دوپہر ڈھل چکی تھی مگر تپش ابھی تک باقی تھی، ابھی ہم آدھے راستے پر پہنچے تھے کہ پیاس کی شدّت نے آلیا مگر اَب صبر کرنا ضروری تھا۔ ایک تو ٹیکسی کی رفتار اتنی تھی کہ وہ رُکتا، ہم کہیں راستے میں پانی کے لیے ٹھہرتے اور پھر سٹارٹ لیتا تو یہ پندرہ بیس منٹ کا عمل تھا اور ڈرائیور مزید بیس منٹ ضائع کرنے کے مُوڈ میں نہیں تھا۔ میں نے بھی اپنا صبر آزمانے کا فیصلہ کیا، ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور اس سے پہلے کہ ان پر پپڑیاں جمنی شروع ہو جائیں ہم تہران پہنچ گئے۔

یہ سپیئر پارٹس کی مارکیٹ تھی، سامنے پانی کی ایک سبیل دکھائی دی اور ڈرائیور نے میرے کہنے سے پہلے ہی گاڑی اس سبیل کے پاس کھڑی کر دی، ہم نے پیٹ، جی، جگر، پھیپھڑے بھر کر پانی پیا، امامؑ کی پیاس یاد کی اور درُود پڑھتے ہوئے ہوٹل روانہ ہو گئے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اَب ہوٹل جا کر پھر شہر واپس آنا بجائے خود ڈیڑھ دو گھنٹے کا عمل ہے، وقت کیوں ضائع کیا جائے چنانچہ میں نے ڈرائیور سے درخواست کی کہ مجھے خیابانِ امیر کبیر چھوڑ دے تاکہ میں وہاں مقیم پاکستانی دوستوں کی مدد سے کچھ تھوڑی بہت شاپنگ کر سکوں۔ ٹیکسی ڈرائیور کے لیے اس سے اچھی آفر اور کیا ہو سکتی تھی، مَیں نے اس کا کرایہ ادا کیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹیکسی چھوڑ دی۔

مَیں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک جھلک سی ہے۔ اس نے مجھے راستہ بھر مہنگائی کا رونا سنایا تھا، گوشت مہنگا ہو گیا ہے، افراطِ زر بڑھ گیا ہے، قیمتیں زیادہ ہیں آمدنی اس تناسب سے نہیں بڑھی وغیرہ وغیرہ مگر جب مَیں اُسے بتاتا کہ یہ سب جنگ کی وجہ سے ہے۔ جنگ بڑی خوفناک چیز ہوتی ہے، قوموں کی اقتصادیات کو برسوں پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ اس کے اثرات مندمل ہونے میں خاصا وقت لگتا ہے تو وہ گہری سانس لے کر کہتا،

"خدا کرے اَب جنگ ختم ہو جائے۔"

فواد صاحب مجھے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئے اور جب میں نے اُن سے شاپنگ کا تذکرہ کیا تو فوراً تیار ہو گئے، سونے کا وہی عالم تھا۔ ۱۸ قیراط کا سونا ہر جگہ دستیاب تھا، میری سب سے بڑی مشکل بیگم صاحبہ کا تحفہ تھا، بچوں اور عزیزوں کے لیے تو کچھ نہ کچھ لے لیا تھا اور یہ اتفاق تھا کہ ابھی بیگم صاحبہ کے لیے کچھ بھی خرید نہیں پایا تھا، میرا خیال تھا کہ سونے کا کوئی لاکٹ وغیرہ لے لوں مگر یہ ممکن نہ ہو سکا، ایک شاندار سی پنورامک قسم کی مارکیٹ میں گئے تو وہاں بھی بچوں ہی کے ملبوسات پسند آئے، بالآخر فیصلہ کیا کہ پرس وغیرہ خرید لیا جائے سُنا ہے یہاں چمڑے کی مصنوعات خاصی اچھی ہوتی ہیں۔ فواد صاحب کو بھی یہ تجویز پسند آئی اور ہم نے بالآخر ایک پرس پسند کر ہی لیا۔ مارکیٹ کے بالکل سامنے ایک سینما ہاؤس تھا یہاں بھی دلیپ کمار کی فلم "مشعل" لگی تھی۔ میں نے سامان ساتھ لیا، دوستوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور پاکستان میں ملاقات کی اُمید پر اُن سے رُخصت ہوا اور ہوٹل پہنچ گیا۔

ڈاکٹر حسنات اور کرنل غفار مہدی جو وطن واپسی پر میرے ہمسفر تھے۔ لابی میں کافی سے شغل کر رہے تھے۔ کرنل صاحب نے میری خریداری کی داد دی اور میرے گھومنے پھرنے اور ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنے کو بے حد سراہا۔ انہیں کیا علم تھا کہ میری یہی آوارہ گردی اور بھاگ دوڑ مستقبل قریب میں ایک کتاب کا رُوپ دھارنے والی ہے۔ ہماری اگلی صبح دس بجے کی فلائیٹ تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ طے ہوا کہ میرے سامان کی پیکنگ میں وہ مدد دیں اور اُن کے سامان کی پیکنگ میں اُن کی مدد کروں، اب ہم چار مسافر تھے۔ ڈاکٹر حسنات اور ڈاکٹر فیصل کو اسلام آباد مجھے لاہور اور کرنل صاحب کو کراچی جانا تھا، میں نے ایران ائیر والوں سے درخواست کر کے کراچی سے لاہور کی نشست بھی کنفرم کروالی تھی جبکہ ڈاکٹر صاحبان کے پاس صرف کراچی تک کا پروانہ تھا۔

ہم رات گئے تک کافی شاپ کے ویٹروں، کاؤنٹر والوں، لابی والوں اور دیگر لوگوں کا شکریہ ادا کرتے رہے۔

حسن بُوصراف ارنا کی کانفرنس کے لیے تہران سے باہر جا چکا تھا اس لیے اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں اپنے لاہور آفس میں ٹیلیکس پر اطلاع بھجوا دی تھی کہ میں کراچی سے شام چھ بجے والی فلائیٹ سے لاہور آرہا ہوں تاہم کراچی پہنچ کر مزید کنفرم کروں گا۔

ہم چاروں اُسی پروٹوکول کے ساتھ نو بجے صبح تہران ایئرپورٹ پہنچے۔ ایران ایئر کا مستعد نوجوان اُسی جوش و جذبے کے ساتھ ہمارے ہمراہ تھا۔ ہم نے فرداً فرداً اس کا شکریہ ادا کیا اور ٹھیک دس بجے ہمارا جمبو جیٹ تہران کی سرزمین سے بلند ہو رہا تھا، واپسی پر فلائیٹ خاصی ناہموار تھی۔ جہاز نے ٹھیک وقت پر کراچی ایئرپورٹ کو چُھوا تو وطن واپس پہنچنے کا ایک عجیب سا احساس رگ و پے میں سرائیت کر گیا۔ خدا کا لاکھ شکر ادا کیا کہ خیر و عافیت سے وطن واپس پہنچے، تمام وقت سکون، عزّت اور احترام کے ساتھ گزارا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ مسافرت بھی ایک معلم ہے اس کے مصداق قلب و ذہن کے بہت سے دریچے وا ہوئے، زندگی کے تجربوں میں ایک گوناں گوں اضافہ ہوا۔

مسافر اپنا سامان اُٹھا کر ٹرالیوں میں رکھ رہے تھے۔ ہمیں کھڑے تقریباً آدھ گھنٹہ ہو چلا تھا مگر ہمارا سامان ابھی تک نہیں آیا تھا، میں نے ازراہِ مذاق کہا کرنل صاحب مجھے لگتا ہے ہمارا سامان بمبئی چلا گیا ہے کیونکہ ہمیں لانے والا جہاز بمبئی جانے کے لیے رن وے پر ٹیکسی کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر حسنات اور کرنل صاحب نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ بہرحال ٹھیک پچاس منٹ کے بعد ہمیں اپنا سامان آتا دکھائی دیا۔ ہم نے سامان اُٹھایا اور ٹرالیوں میں رکھا اور گرین سگنل پار کر گئے، ڈاکٹر فیصل کو کوئی جاننے والا مل گیا تھا وہ اس کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ کرنل صاحب کو لینے کے لیے ایئرپورٹ پر اُن کے عزیز موجود تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو خُدا حافظ کہا اور ڈومیسٹک ٹرمینل کی طرف جانے والی بس کی طرف چل دیئے۔ ڈاکٹر صاحب کو اسلام آباد کی فلائیٹ کی فکر تھی اُن کا کہنا تھا کہ مجھے

پرسوں ہر حال میں دفتر پہنچنا ہے۔ منیلا میں ایک اور کانفرنس ہے۔ اس کی تیاری کرنا ہے۔ اگر سیٹ نہ ملی تو بڑا مسئلہ ہو گا۔ اُنہوں نے مشورہ دیا کہ سامان کو داتا بیگیج سروس کے حوالے کرتے ہیں اور نشست کا بندوبست کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنا سارا سامان داتا بیگیج سروس کے حوالے کر کے ہم کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ میری نشست کنفرم تھی، ڈاکٹر صاحب کا مسئلہ ابھی باقی تھا اور جب ہمیں قطار میں تقریباً ۴۵ منٹ تک انتظار کرنے کے بعد یہ جواب ملا کہ کوئی سیٹ نہیں ہے تو خاصی مایوسی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنا تعارف کروایا کہ بھائی ایران سے آرہا ہوں، فارن منسٹری سے میرا تعلق ہے۔ میرا آج اسلام آباد پہنچنا بے حد ضروری ہے تو وہ صاحب ایک بار پھر کمپیوٹر پر انگلیاں چلانے لگے۔ وہ ساتھ ساتھ ایران کے حالات کے بارے میں سوالات بھی کرتے جارہے تھے۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو کہنی ٹکائی کہ بھائی اب سمجھو کام بن گیا اور پھر واقعی کام بن گیا اور ڈاکٹر صاحب کی نشست اوکے ہوگئی۔ ہم سکائی روم میں آئے۔ چائے وغیرہ پی۔ ساڑھے چار بجنے لگے تھے مَیں نے اجازت لی، مجھے گھر فون بھی کرنا تھا اور یوں بہت سی خوشگوار یادیں لے کر میں ڈاکٹر حسنات سے رُخصت ہوا۔ بورڈنگ کارڈ لے کر لاؤنج میں پہنچا تو ایک کونے میں سیّد طیّب رضوی دکھائی دیئے۔ سلام دُعا ہوئی، انہوں نے چائے منگالی۔ ایران کے حالات پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے گھر ٹیلیفون ملایا تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ صبح سے بے حد پریشان ہیں۔ نیند کی گولی کھا کر سو رہی ہیں کیونکہ دفتر سے اُنہیں یہ پیغام ملا تھا کہ میں صبح چھ بجے کی فلائٹ سے لاہور پہنچ رہا ہوں۔ بچے صبح سات بجے تیار ہو کر ائیر پورٹ پہنچے تھے۔ اور مجھے نہ پا کر اُنہیں نہ صرف مایوسی ہوئی بلکہ وہ فکر مند بھی ہوئے کہ ایک تو اتنے دنوں رابطہ نہیں کیا۔ اُوپر سے جس فلائٹ سے آنے کا پیغام ملا تھا اِس فلائٹ سے آئے بھی نہیں۔ مجھے بھی اس پر سخت افسوس ہوا۔ فون کر کے پھر سیّد طیّب رضوی سے گفتگو ہونے لگی۔ وہ ایران کے حالات خاصی دلچسپی سے سُن رہے تھے۔ لاؤنج میں لگے کلوز سرکٹ ٹی وی پر ون ڈے کرکٹ میچ

دکھایا جارہا تھا کہ اس اثنا میں اپنے امجد اسلام امجد بھی آگئے، وہ ٹی وی کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں کراچی آئے تھے۔ اُن سے مزید گپ شپ ہوئی۔ اپنے نعیم بخاری بھی دکھائی دیئے مگر وہ "فرسٹ کلاس مسافر" ہیں۔ اس لاؤنج میں اُن کا کیا کام۔

موسم قدرے ابر آلود تھا اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہماری ایئربس ایک گھنٹہ ۲۵ منٹ میں لاہور پہنچ گئی۔ بچے ایئرپورٹ پر موجود تھے، گھر پہنچے۔ دادی نے بلائیں لیں۔ امی اور ابو نے گلے لگایا، بچے بھی مسرور تھے اور بھائی بہن بھی۔

مشہد اور قُم سے لایا ہوا تبرک اُن کی خدمت میں پیش کیا، میں ایران گیا تھا تو ایک مسافر تھا واپس آیا تو زائر بن چکا تھا۔ یہ ہم سب کے لیے ایک اعزاز تھا۔ وقت کی رفتار کتنی تیز ہے، آج تک کوئی اس کی باگیں نہیں تھام سکا۔

مجھے ایران سے آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک دوست کا فون آیا "بھائی اخبار والے! شہر میں ایک افواہ ہے، بتاؤ تو کیا یہ خبر درست ہے، "لوگ کہہ رہے ہیں کہ جنرل ضیاء کا جہاز گر گیا ہے اور ... ..." اور میں تو ابھی گھر سے نہیں نکلا۔ دفتر فون کر کے کنفرم کرتا ہوں"۔

میں نے دفتر فون ملایا تو فاروق نے میرے سوال کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ خبر درست ہے ابھی تک صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ جہاز گر گیا ہے اور جنرل ضیاء اپنے ساتھیوں سمیت جاں بحق ہو گئے ہیں۔ کیوں گرا، کیسے گرا؟ تفصیلات کا ابھی کسی کو علم نہیں" اور میرے خدا! تو کتنا عظیم ہے۔ میں نے تو تیرے منتخب کردہ ایک امامؑ کے روضے پر یہ دعا مانگی تھی کہ میرے وطن کو خوشحال کر، اسے سلامت رکھ، اسے جمہوریت کے سورج کی روشنی سے منور کر۔ خدا نے میری دعا اتنی جلدی سُن لی تھی مجھے اس کا یقین نہیں آرہا تھا کہ میری دعا کے ۴۸ گھنٹے کے اندر میرے وطن میں جمہوریت کی صبح کا آغاز ہونے کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور قرآن کی آیات پڑھ پڑھ کر جھوٹ بولنے والا آمر اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ یہ دعا تو میری دادی ماں اور

وہ سینکڑوں مائیں روز مانگا کرتی تھیں جن کے بے گناہ بچے جیل کی کوٹھڑیوں میں اپنی جوانی مختلف جان لیوا بیماریوں کی نذر کر رہے تھے۔ جن کے ہیرے جیسے جوانوں نے اپنی پیٹھوں پر ظلم کے کوڑے برداشت کیے تھے۔

آج مجھے اپنے دوست جہانگیر بدر، خاور نعیم ہاشمی، مختار اعوان اور طلعت جعفری بہت یاد آئیے ، مجھ گنہگار کی دُعا اتنی جلدی کیسے قبول ہوگئی اور پھر مجھے سیّد افضل حیدر کے وہ الفاظ یاد آنے لگے۔

"امام رضاؑ کے در پر مانگی جانے والی پہلی چار دُعائیں خُدا ہر حال میں قبول کرتا ہے۔"

Imam Khomeini Library
Karachi.

ایرانی عالم امریکی مندوب ڈاکٹر ہملٹن سے گفتگو کر رہے ہیں

پین نیم: افضال شاہد، پیدائش: ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء تعلیم: ایم اے سیاسیات، صحافت میں تجربہ ۱۹ سال جس میں "جنگ"، "نوائے وقت"، "مشرق"، "مساوات" میں مُدیر معاون مدیر اور انٹرویور کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے علاوہ پندرہ روزہ "سکھی گھر" آبادی نامہ، نئی صدی، ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ اور ماہانہ "پلک" اور "جگنو" کے لئے مدیر کی حیثیت میں کام کیا۔ ریڈیو پاکستان کے لئے کھیل، فیچر اور کمرشل لکھے جن میں سکھی گھر اور صبح دم زیادہ مقبول ہوئے۔ سٹیج پلیز میں "آؤ سچ بولیں" "اجالے سے پہلے" "حسینہ مان جائے گی" اور "ایک جا دو"۔ بہت مشہور ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ پی ٹی وی کے لئے کمپیئر کی حیثیت میں بھی کام کیا۔ ریڈیو ڈرامے پاکستان کے ریڈیو سے نشر ہوتے رہے۔ پی ٹی وی کے گریڈ اے کمپیئر میں شامل ہوئے۔ کچھ سوانح عمریاں بھی لکھیں جن میں مشہور پینٹر صادقین، فوک سنگر شوکت علی اور پوپ سنگر اے نیر شامل ہیں۔ بیرونِ ملک مختلف کانفرنسوں اور تقریبات میں، سعودیہ، مشرقِ وسطیٰ اور ایران میں بطور صحافی اور سکالر پاکستان کی نمائندگی کی اور اس وقت اپنے پندرہ روزہ "دستک" سے منسلک ہیں۔